JANUARY 1963.

www.taemeernews.com

ایک مکمل ماہنامہ

پیکر

پوسٹ بکس ۲۲۳ حیدرآباد ۱

جنوری ۱۹۶۳ء

تیسرا سال　　　پہلا شمارہ

مدیران

اعظم راہی

رؤف خلش

خان معین

سرورق: منی پوری رقص

کتابت: محمد غالب

■ — پیکر میں شائع ہونے والے افسانوں اور کہانیوں میں نام مقام، کردار اور واقعات فرضی ہیں، ان سے مطابقت محض اتفاقی ہے

■ — پیکر میں شائع ہونے والے مضامین افسانے نظمیں اور غزلیں وغیرہ غیر مطبوعہ ہیں۔

قلم نگار

دی۔ ناراین کرن ریڈی
راجہ مہدی علی خان
عوض سعید
کنول پرشاد کنول
خیرات ندیم
مغنی تبسم
جیلانی بانو
مجیب الرحمان
وحیدہ نسیم
محمد علوی
رشید الدین
مصور سبزواری
سید احمد شمیم
رفعت صدیقی
عطاء الرحمان ارشاد
شمیم جوراوی
صمد پرویز
ظہیر بنگلوری
ساجن بھارتی

مستقل عنوانات

زاویے		اعظم راہی
خط و خیال	خطوط	قارئین
پرچھائیاں	فلمی خبریں	نمائندہ خصوصی
نگاہ	فلمی تبصرے	محمود انصاری
	کھیلوں پر تبصرے	محمود انصاری

قیمت سالانہ　　۳ روپے

فی پرچہ　　۲۵ نپ

ماہنامہ پیکر

جنوری 1963

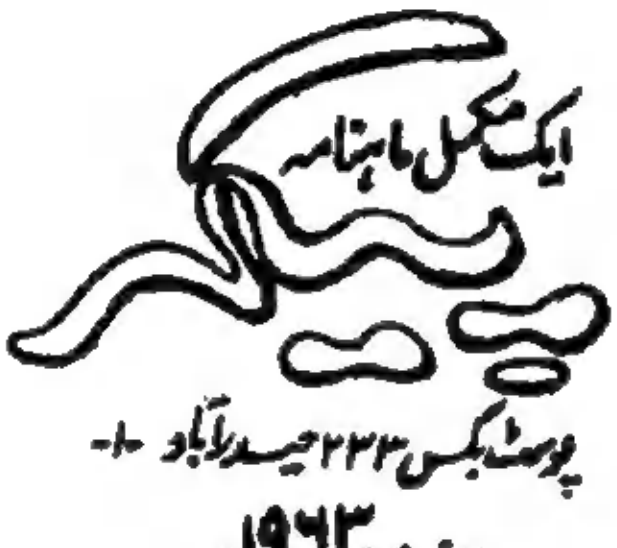

ایک مکمل ماہنامہ

پیکر

پوسٹ بکس ۲۲۳ حیدرآباد ۔۱

جنوری سنہ ۱۹۶۳ء

تیسرا سال — پہلا شمارہ

مدیران

اعظم راہی

رؤف خلش

خان معین

Download Link

https://www.taemeernews.com/2020/11/paiker-jan1963-pdf.html

www.taemeernews.com

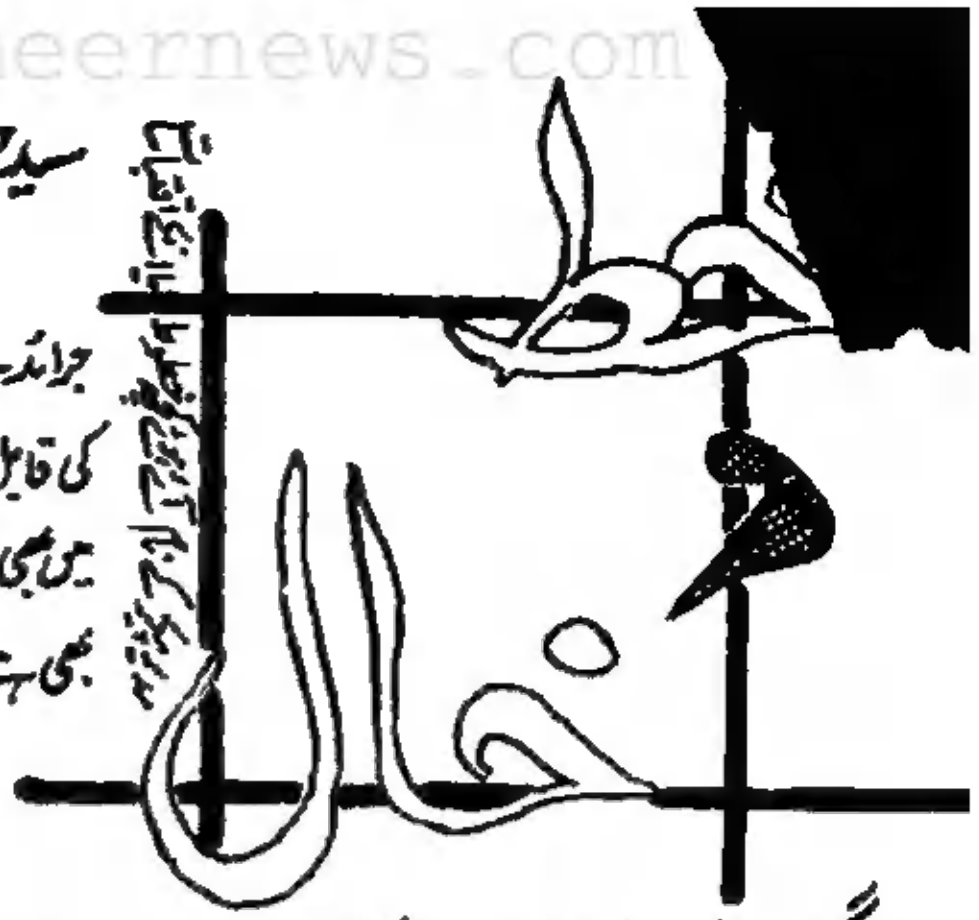

خط و خیال

سید حرمت الاکرام ۔ مرزا پور:

پیکر اپنے مواد کے اعتبار سے دوسرے جرائد سے کافی منفرد ہے۔ آپ نے اسے متنوع بنانے کی قابل قدر کوشش کی ہے۔ ظاہری دلکشی و زیبائش میں بھی پیکر کو خوش پیکر کہنا پڑتا ہے۔ سرورق میں فنکاری بھی ہے اور پرکاری بھی۔

اطہر خورشید ۔ حیدرآباد:

پتہ نہیں کیوں آپ اپنا نقصان کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میرے خیال میں تو پیکر کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی قیمت میں اضافہ ضروری ہے۔

تسنیم فاروقی ۔ لکھنو:

پیکر میرے دائرہ احباب میں راکٹ کی طرح مشہور ہو چکا ہے۔

صادق اندوری ۔ اندور:

اس دور میں جتنے بھی رسالے نکل رہے ہیں ان میں معیاری رسائل کا شمار انگلیوں پر ہی کیا جا سکتا ہے لیکن پیکر کو ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

رئیس انور ۔ لکھنو:

آپ حیدرآبادیوں کو غالباً یہ خوش فہمی ہو گئی ہے کہ حیدرآباد کی عمارتیں سارے ہند میں مشہور ہیں، جبھی تو رؤف خلش نے آرکیٹکچر پر مضمون لکھتے ہوئے جگہ جگہ ان کا حوالہ دیا ہے۔ آئندہ سے یا تو مشہور عمارتوں کے حوالے دیجئے یا پھر باتصویر پرچہ شائع کیجئے۔

غوث احمد خاں ۔ بنگلور:

احمد جلیس کا طنزیہ مضمون "تنگیٔ جامہ کی حکایت" دلچسپ ہے تو کیا ہوا انتہائی مبالغہ آمیز اور ناقابل یقین ہے۔

جوگندر پال ۔ نیروبی (مشرقی افریقہ)

پیکر کے بعض مضامین کی افادیت سے بہت متاثر ہوا۔ یہ درست ہے کہ ہمارے اردو رسائل کو مزید متنوع اور افادی ہونا چاہیے۔ زندگی کی بدلتی ہوئی اقدار کا بھی یہی تقاضا ہے تاہم ماہناموں کے فرائض روزناموں اور ہفتہ وار اشاعتوں کے فرائض سے اس لیے زیادہ مشکل ہیں کہ ان کے لب و لہجہ میں ادبی وقار کی موجودگی بھی ناگزیر ہے۔

زبیر رضوی ۔ دہلی:

اتنے دنوں بعد میں نے ایک نظم موجودہ صورت حال پر لکھی تھی جو "محور" میں بعض مصلحتوں اور مطالبوں کے پیش نظر شریک کرنی پڑی۔ کوئی پرانی چیز آپ کو بھیجنا نہیں چاہتا۔ اس لیے ابھی اور مجھے شرمندہ ہو لینے دیجئے۔

ہربنس دوست ۔ بمبئی:

ادھر کچھ Commitments میں بری طرح مصروف ہوں لیکن امید ہے کہ جلد ہی کہانی کا وعدہ ایفا کر دوں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔

www.taemeernews.com

پیکر

ایک مکمل ماہنامہ

زاویے

ہندوستان کی آبادی ایک اندازے کے مطابق ۴۴ کروڑ سے زاید ہے لیکن افسوس کا مقام ہے کہ موجودہ ہنگامی حالات کے پیش نظر قومی دفاع کے لئے جو فنڈ جمع کیا جا رہا ہے اس میں صرف دس فیصد عوام ہی نے حصہ لیا ہے۔ ملک کو درپیش حالات کے پیش نظر ہر ہندوستانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی حیثیت و بساط کے مطابق اس فنڈ میں کچھ نہ کچھ جمع کروائے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ سوائے چند لوگوں کے باقی سب اس سلسلہ میں خاموش ہیں۔ خصوصاً سرمایہ دار طبقہ انجان ہے۔

اس کے علاوہ موجودہ ہنگامی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند مفاد پرست قوالی، ناچ رنگ، کلچرل پروگرام، فلم شو وغیرہ کے ٹکٹ "قومی دفاعی فنڈ" کے نام پر فروخت کرکے عوام کو دھوکا دے رہے ہیں۔

اگر حکومت فنڈ اور عطیے جمع کرنے کے موثر طریقے اختیار نہ کر سکی تو اس میں عوام اور حکومت دونوں کا نقصان ہے

اعظم راہی

www.taemeernews.com

تھوریو

وی۔ نارائن کرن ریڈی

اہنسا کا علمبردار ایک امریکی ادیب جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا تھا

تھا اور سول نافرمانی کے ذریعہ حکومت کے ان منافی اقدامات کی عدم تعمیل کرنا چاہتا تھا۔

تھوریو صرف ادیب ہی نہیں تھا بلکہ وہ شاعر اور مفکر بھی تھا۔ اس کی تصنیفات میں نثری کتابوں کے علاوہ شعری مجموعے، خطوط کے مجموعے اور تاثرات و مشاہدات کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ اس کے دوستوں میں قابل ذکر دو ہستیاں ہیں ایک ایمرسن اور دوسری اسکاٹ جس نے تھوریو کی سوانح حیات لکھی ہے۔

تھوریو کا پورا نام ہنری ڈیوڈ تھوریو تھا۔ وہ ۱۲ جولائی ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ پنسلیں بنایا کرتا تھا۔ تھوریو محنت کش طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس پر بھی اس نے اپنی تعلیم کی طرف خاص توجہ دی اور ۱۸۳۷ء میں ہاورڈ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ تھوریو نے بعد میں ایک ڈپلوما کورس کی تکمیل بھی کی تھی۔ مگر پیسے داخل کر کے یونیورسٹی سے ڈپلوما حاصل کرنے کی بجائے اس نے اسے ہمیشہ کے لئے یونیورسٹی کی الماریوں میں پڑا رہنے دیا۔ بعد میں تھوریو نے کہا کہ اگر وہ ڈپلوما حاصل بھی کر لیتا تو کونسا فرق پڑ جاتا گویا اس کے نزدیک وہ غیر ضروری چیز ہی تھی۔

تھوریو عام انسانوں سے بہت مختلف تھا اس کی عادات و اطوار سوچنے اور دیکھنے کا ڈھنگ عمل کے طریقے سب ہی عام انسانوں سے مختلف تھے۔ وہ تنہائی کا دلدادہ اور فطرت کا عاشق تھا۔ اس نے ایک تالاب کے کنارے اپنے لئے لکڑی کا ایک کیبن خود اپنے ہاتھوں سے تیار کر لیا تھا۔ اور دن بھر اس میں رہتا تھا۔ اس کیبن کے آس پاس گھنے جنگل اور عمدہ قدرتی مناظر تھے جب اس کا دل اکیلے رہتے رہتے

www.taemeernews.com

ڈی۔ نارائن کرن ریڈی جامعہ عثمانیہ کے شعبہ کے نگراں ہیں۔
یہاں ان کا ایک مضمون "تھوریو" شائع کیا جا رہا ہے جو ایک قابل قدر تحقیق ہے
اس مضمون پر امریکی ادب کے ممتاز پروفیسر گورڈن نے جو آجکل کچھ مدت کے لئے جامعہ
عثمانیہ کے اعزازی پروفیسر ہیں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ
"امریکہ میں بہت کم ایسے ادیب ہیں جنوں نے تھوریو پر لکھنے کی کوشش کی ہے
مسٹر کرن ریڈی کا یہ مضمون ایک مکمل تحقیق ہے۔ انہوں نے امریکہ کے
اس غیر معروف عظیم ادیب کی زندگی اور فلسفہ پر روشنی ڈال کر اسکی چھپی
ہوئی خوبیوں کو حسن فراخدلی سے نمایاں کیا ہے وہ ایک عظیم کارنامہ ہے۔"

امریکہ کے ایک اسکول میں اسکول کے منتظم اور اسکول ماسٹر کے درمیان تکرار ہو رہی تھی منتظم کا خیال تھا کہ نظم و نسق اور رعب داب قائم رکھنے کے لئے اُسے اپنے شاگردوں کو سزا دینی چاہیئے۔ مگر اسکول ماسٹر سزا کے بالکل خلاف تھا۔ جب بحث نے بہت طول کھینچا تو اسکول ماسٹر اپنا استعفیٰ داخل کر کے چلا گیا، مگر سزا دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔

ایک جگہ بہت سے لوگ جمع تھے اور خاصا ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بحث دراصل ایک شخص اور ٹیکس وصول کرنے والوں کے درمیان تھی۔ ایک شخص پول ٹیکس دینے سے انکار کر رہا تھا۔ اور کارندے احکامات کے تحت اس سے ٹیکس لینے پر مصر تھے۔ بالآخر بحث نے طول کھینچا اور عدم ادائی ٹیکس کی علت میں اس شخص کو جیل جانا پڑا۔

یہی شخص تھوریو تھا۔ انیسویں صدی کے امریکی ادیب جس نے "سول نافرمانی" جیسی تصنیف لکھ کر آنے والے کئی رہنماؤں اور کئی لوگوں کو اہنسا کا راستہ دکھایا۔ وہ انسانی جذبات کا اتنا خواہاں تھا کہ اپنے شاگردوں کو تک سزا دینا نہیں چاہتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہ انسانی حقوق کا اتنا پاسباں تھا کہ اسے جیل جانا منظور تھا مگر ایک غلط قسم کا ٹیکس ادا کرنا منظور نہیں تھا۔ گو بعد میں اس کے چچا نے مطلوبہ ٹیکس کی رقم داخل کر کے اسے رہا کر دیا۔ بات دراصل یہ نہیں کہ تھوریو یہ ٹیکس ادا نہ کر سکتا تھا مگر وہ دیدہ و دانستہ ایک غلط قسم کے ٹیکس کے خلاف اپنے جذبے کا اظہار کرنا چاہتا

www.taemeernews.com

اکتا جاتا تو اس کے باہر نکل جاتا اور جنگلوں اور پہاڑوں کی سیر کرتا۔ وہ گھنٹوں یونہی گھومتے گزار دیتا مگر اسے وقت کے گزرنے کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا۔ وہ الگ تھلگ رہنے اور قدرتی مناظر سے محظوظ ہونے میں بڑا سکون محسوس کرتا۔

تھورو انفرادیت، آزادی، مساوات اور انسانی احساسات کا زبردست علمبردار تھا۔ اور ان چیزوں کے حصول اور ان کی حفاظت کے لئے وہ اہنسا کے طریقے کو ترجیح دیتا تھا۔ اُس کے اِس نظریے کی بعد میں بہت سے مفکروں نے خوشہ چینی کی اور بہت سی تحریکوں میں یہ سنگ میل ثابت ہوا۔

رکھتا تھا۔ وہ ایک شاعر، ادیب، مفکر کے ساتھ ساتھ فلسفی بھی تھا۔ مگر ہم اسے ہیگل، کانٹ اور دیگر فلسفیوں کی طرح باضابطہ اس زمرے میں شامل نہیں کر سکتے مگر اس حیثیت سے کہ اس نے اپنی زندگی اور تحریروں میں ایک خاص طرز زندگی اور خاص خیالات کو پیش کیا ہے اسے ایک فلسفی کہہ سکتے ہیں۔

اتنا سب ہونے کے باوجود تھورو اپنے زمانے میں بھی گمنام ہی تھا۔ اور آج بھی گمنام ہی ہے۔ یقیناً امریکی ادب میں اسے نظر انداز کیا گیا۔ اس طرح جس طرح بورس پاسترناک کو روسی زبان و ادب میں نظر انداز کیا گیا۔ دراصل دنیا میں ایسا

آفریقہ میں قیام کے دوران گاندھی جی بھی تھورو کے نظریہ سے متاثر ہوئے ___

خود جنوبی امریکہ میں غلاموں کی آزادی اور حبشیوں کے ساتھ مساوی سلوک کے لئے یہ نظریہ بہت کارگر ثابت ہوا۔ آفریقہ میں قیام کے دوران گاندھی جی بھی تھورو کے اسی نظریہ سے متاثر ہوئے اور جسے انھوں نے بعد میں اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا اور بالآخر اسی حربے کے استعمال سے انھوں نے ہندوستان کو بھی آزاد کرایا۔ گاندھی جی تھورو سے بے انتہا متاثر تھے۔ اور اپنے قیام آفریقہ کے زمانے میں ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ تھورو کی کتاب "سول نافرمانی" کی ایک جلد رہتی تھی۔

تھورو دنیا کے نامور شاعروں، ادیبوں اور مفکروں جیسے "روسو، ٹالسٹائی، ورڈسورتھ، ییو ہمالس کبھی اور گولڈ اسمتھ وغیرہ سے بہت مماثلت

ہی ہوتا آیا ہے۔ یہاں بہت سے لوگ یونہی مشہور ہو جاتے ہیں اور بہت لوگ جنھیں واقعی مشہور ہو جانا چاہئے تھا نہیں ہو پاتے۔ یہاں تعلقات اور پروپگنڈے کو بہت زیادہ دخل ہے۔ کیونکہ تھورو ان دونوں باتوں سے کوسوں دور تھا۔ اس لئے اس کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ آج ہمارے سامنے ہے، خود امریکی اپنی گدڑی میں لعل دبائے بیٹھے ہیں اور بہت سے ایسے لوگ جو قطعی لعل کہلانے کے مستحق نہیں آج امریکی ادبی زندگی میں لعل بن کر چمک رہے ہیں۔ چنانچہ جب میں نے تھورو پر ایک امریکی رسالہ میں اپنا مضمون شائع کروایا تو امریکی ادبی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچ گئی اور بہت سے امریکیوں نے یہ محسوس کیا کہ ؎

ایسی چنگاری بھی ہمارے اپنے خاکستر میں تھی

باقی صفحہ ۵۲ پر

www.taemeernews.com

قطعات

عقل کا دور ہے، اس دور میں کوئی اے دوست
جوہرِ فطرتِ انساں کو پرکھتا ہی نہیں
بزمِ دنیا ہے کنولؔ، آج اک ایسی محفل
جس جگہ بات کوئی دل کی سمجھتا ہی نہیں

تھک گئیں تجھ کو کھوجتے آنکھیں
تو کہیں بھی نظر نہیں آتا
چل رہا ہوں، ازل سے میں لیکن
اب اکیلے، چلا نہیں جاتا

کنول پرشاد کنولؔ

عورت اور عورت

.... ابھی وہ دھوپ میں نہا ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک زوردار طمانچے کی آواز سنی اور پھر یکایک موٹی موٹی گالیوں کے ساتھ ایک شور سا بلند ہوا۔ آج خلافِ معمول وہ اپنے یار کی شان میں مُغلظات بک رہی تھی، اور جواباً اس کے یار نے چپ سادھ لی تھی۔ .....

وہ کالے رنگ کی ایک بھدی سی عورت تھی۔ عمر ہوگی یہی کوئی تیس پینتیس برس مگر وہ اپنی عمر سے کچھ کم ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چہرے کے خطوط میں کوئی قابلِ ذکر بات نہ تھی نہ آنکھیں ہی ٹھیک تھیں اور نہ لب لیکن عجیب بات یہ تھی کہ سب ہی اس کے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ باقاعدہ طور پر پیشہ کرنے والی عورت نہ تھی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ وہ کسی ایک اچھے گھرانے کے آدمی کو ایک دو ماہ کے لئے پھانس لیتی۔ رات بھر رنگ رلیاں ہوتیں اور صبح کی سفیدی کے ساتھ ہی گھر آیا ہوا گاہک غائب ہو جاتا۔

اس کا مکان شہر کی ایک گنجان آبادی میں تھا۔ جہاں اکثریت شرفاء کی تھی۔ اس کے مکان کے بالکل بغل میں ایک نوعمر طالب علم کا مکان تھا جس کا آخری سہارا اس کی اپنی بوڑھی ماں تھی۔ اس سے ذرا پرے ایک بوڑھے وکیل کا مکان تھا جس نے وکالت چھوڑ کر کرانہ کی ایک دوکان کھول لی تھی درمیان میں چند مڈل کلاس کے لوگ آباد تھے جن کے مکانوں کی چھتیں ٹپکتی تھیں۔

ظاہر ہے جہاں شریف آدمی بستے ہوں وہاں رادھا بائی جیسی آوارہ عورت کا کیا کام ہو سکتا تھا۔ چھ آٹھ ماہ تک تو کسی کے کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ فرحت نگر میں ایک ایسی عورت کا بھی ٹھکانہ ہے جو

عوض سعید

رات کی سیاہی میں اپنی عصمت کا بیوپار کرتی ہے۔

یہ بات کہاں تک پوشیدہ رہتی؟ آخر محلے کے چند شریف نوجوانوں نے اس کا پتہ چلا ہی لیا۔ جونہی یہ بات عام ہوئی محلے کی برگزیدہ ہستیوں نے رادھا بائی کے خلاف ایک محضر تیار کیا جس پر محلے کے سارے لوگوں نے خوشی خوشی اپنے دستخط ثبت کئے۔ لیکن سب لوگوں کا منہ اس وقت حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا جب انھوں نے دفعتاً ایک منحنی جسم کے نوجوان کو اطمینان کے بھرپور لہجے میں انکار کرتے ہوئے سنا۔ ایکبارگی سب لوگوں کی نگاہیں اس کے سانولے سلونے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ انیس، بیس سال کا ایک دُبلا پتلا سا نوجوان تھا۔

مجمع میں سے کسی نے اُسے پہچان کر کہا۔

"ارے یہ تو اسی کا پڑوسی ہے، ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ جب ہی تو مہاشے دستخط کرنا نہیں چاہتے۔"

"تمہیں اس محضر پر ابھی دستخط کرنا ہوگا۔" ایک گٹھیلے بدن کے بدصورت آدمی نے آگے بڑھ کر رعب دار آواز میں کہا۔

لیکن اس نے بغیر خوف کھائے پورے اطمینان کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔

"دستخط نہیں کروگے؟"

ایک ساتھ کئی بے ڈھنگی بے سری آوازیں فضا میں ارتعاش پیدا کر گئیں۔

"نہیں ـــــ" کی نرم و ملائم آواز نے جواباً فضا میں تھرتھراہٹ سی پیدا کر دی۔ اور نہیں کے ساتھ ہی کئی لوگوں کے ہاتھ اُٹھے۔

دوسرے لمحے ہی میں وہ دُبلا پتلا سا نوجوان شکست خوردہ حالت میں ریتلی زمین پر ادھ موا سا پڑا تھا۔

ہوش آنے پر جب اس نے اپنے گھر کی راہ لی تو اسے دیکھ کر اس کی ماں کا کلیجہ پھٹ سا گیا۔

"کیا ہوا میرے لال ـ کس ظالم نے تجھے مارا ہے۔ خدا اس کا ستیاناس کرے"۔ وہ کوسنے دیتی ہوئی دیر گئے تک بڑبڑاتی رہی۔

اور اس نے جھوٹ موٹ بہانہ تراشتے ہوئے کہہ دیا کہ دراصل اُسے کسی نے مارا وارا نہیں بلکہ وہ راستہ میں ٹھوکر کھا کر گر پڑا تھا۔

بوڑھیا کے کوسنے سن کر رادھا بائی نے دروازے میں سے جھانک کر کہا۔ "کیا ہوا ماں جی۔ کیوں بسور رہی ہو۔"

"ادھر آنا بیٹا رادھا ـ دیکھ تیرے مدن کی کیا حالت ہوئی ہے۔"

بوڑھیا نے نیم بسورتے کے انداز میں کہا۔ وہ دوڑی ہوئی آئی، اس کے گالوں کو پیار سے تھپتھپایا جہاں جہاں اس کے چوٹیں آئی تھیں۔ اس پر آیوڈین کا پھایا رکھا۔

وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ ذرا بھی اس نے آواز نہیں کی۔ حالانکہ اس وقت آیوڈین لگانے سے اسے بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب رادھا بائی کے سنے آتے ہوئے بوسہ پیار نے لیے

آواز دی تو وہ کچھ جھینپتے ہوئے آئی نگہتے ہوئے چلی گئی۔

رادھا بائی کو بوڑھیا کے نوجوان بیٹے سے بڑا پیار تھا۔ ایسا ہی پیار جیسا ایک بچے کو اپنی ماں کی محبت بھری آغوش میں ملتا ہے۔

گئے برس جب بوڑھیا نے اپنی تنگ دستی سے مجبور ہو کر اس کی تعلیم چھڑوا دی تھی تو رادھا بائی نے اپنی گرہ سے فیس دے کر اُسے میٹرک میں دوبارہ شریک کروایا تھا۔

جب بوڑھیا کے بیٹے کے ہاں تیل ختم ہو جاتا تو وہ چپکے سے اپنے شیشے سے آدھا کوکونٹ آئیل اس کے خالی شیشے میں بھر آتی اور وہ رادھا بائی کے احسانوں کے بوجھ تلے دب سا جاتا۔

رادھا بائی کو کتنا خیال تھا اس کا۔ کیا کوئی ایک فاحشہ عورت سے اس قسم کے سلوک کی امید کر سکتا ہے بالوں کے تیل سے لے کر تعلیم تک کی منزلوں پر اس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے دل میں رادھا بائی کے لیے بڑا احترام تھا۔

جب وہ اس سے بات کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ کسی فاحشہ سے نہیں کسی مقدس مقام کی پاکباز عورت سے ہمکلام ہو رہا ہے۔ اس کی آنکھوں کی ڈوروں میں بسی ہوئی چکیلی کاجل کی لکیر اُسے اور بھی مقدس بنا رہی ہوتی۔

لیکن کبھی کبھی اس کے دماغ کی چٹان سے سوچ کی ایک گہری لہر ٹکراتی ہوئی دور دراز تک پھیل جاتی۔ جہاں اس کے آوارہ خیالوں کے ننھے ننھے پتھر ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں پھیل جاتے اور وہ سوچ کی ناہموار گہرائیوں میں پہونچ کر کسی ماہر غوطہ زن کی طرح پاتال میں چلا جاتا وہاں سے خوبصورت موتیوں کی بجائے اسے چھوٹے چھوٹے کنکر ملتے جسے وہ جھنجھلاتا ہوا کنارے پر آ کر پھینک دیتا۔

اس طرح وہ رادھا بائی کی زندگی کے محل سرا کے بارے میں ذرا بھی نہ سوچ سکا۔ اور ہر بار اس نے اپنے منہ پر ایک تالا سا پڑا پایا۔۔۔

جب اس نے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا تو رادھا بائی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اس نے غوث پاک کے نام پر محلے کے کئی فقیروں کو پیٹ بھر کھانا کھلایا تھا اور ایک شاندار نیاز کی تھی جسے دیکھ کر بہت سے لوگ جل اُٹھے تھے۔ اور اس وقت اس کی ماں کی ویران آنکھوں کے گوشوں میں مسرت کے آبدار موتی چمک سے گئے تھے۔ اور اس کا قبر کی طرح تنگ مکان مہمانوں کی زیادتی سے پھٹ پڑا تھا۔ اور جب گذشتہ واقعات کے سائے اس کے دماغی افق پر دوڑنے لگے تو اس کا سر فرطِ احترام سے جھک گیا۔

پھر ایک دن بوڑھیا نے بیٹھے بیٹھے ہی بڑے دلار سے کہا۔ "بیٹا اب تم نے دسویں جماعت پاس کر لی ہے کہیں نوکری ڈھونڈھ کیوں نہیں لیتے۔ میرا کیا ہے پیر قبر میں لٹک رہے ہیں۔ کون جانے کب آنکھ بند ہو جائے۔ پنشن کے تیس روپوں میں زندگی کی گاڑی چلنے سے تو رہی۔ بے چاری رادھا آخر کب تک ہمارا ساتھ دے سکے گی۔ جب تک جوانی ہے اسے کوئی فکر نہیں لیکن بعد کو بے چاری کا کیا حال ہوگا۔ کبھی تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے؟"

جب بوڑھیا نے نصیحتوں کا یہ طومار باندھا

تو اُسے احساس ہوا کہ واقعی وہ ایک بے حس انسان ہے۔ آخر دوسروں کے رحم و کرم پہ جینا کونسی شرافت ہے۔ انسان کو دوسرے کے لئے نہیں بھی اپنے لئے تو کچھ کرنا ہی چاہیئے۔ وہ دل ہی دل میں شرمندگی سے بڑبڑا اٹھا۔

دو سال تیزی سے نکل گئے لیکن رادھا بائی کے خلوص میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ اور بوڑھیا حسب عادت بڑبڑاتی رہی۔ ایک سال اور تیزی سے بیت گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک دن بوڑھیا نے چپکے سے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی۔

دوپہر سے گھر میں خاموشی طاری تھی۔ رادھا بائی نے اس خیال سے کہ وہ آج کئی دنوں بعد میٹھی نیند سو رہی ہے اس لئے اسے اٹھایا بھی نہیں لیکن جب شام کے پانچ بج گئے تو رادھا بائی نے اپنے گھر کی دیوار سے جھانکتے ہوئے بوڑھیا کو پکارا۔ جواب نہ آنے پر وہ چونک سی گئی اور پھر جب اندر آکر اس نے بوڑھیا کے کمرے میں قدم رکھا تو اس کا جسم مارے خوف کے کانپ سا گیا۔

بوڑھیا مُنہ کھولے بے سدھ سو رہی تھی اور اس کے منہ پر مکھیاں بھنا رہی تھیں۔ اس کے پیروں تلے کی زمین نکل گئی۔ کچھ سنبھل کر اس نے جلدی سے بوڑھیا کے چہرہ کو ٹھیک کیا اور اس کے جسم پر اپنے پلنگ کی سفید چادر لاکر اوڑھا دی۔

آج خلافِ معمول اس کا بیٹا بھی صبح ہی سے غائب تھا۔ رات کے دس بجے کے قریب جب وہ گھر لوٹا تو رادھا بائی نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بڑے ہی دردناک لہجے میں اس ٹریجیڈی کو سنایا۔ اور اسے پیار سے اپنے گلے لگالیا۔ وہ چپکے سے اپنے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے لب سرد پڑ گئے اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نکل نہ سکا وہ اتنا گم سم ہوگیا کہ اسے یاد تک نہ رہا کہ ابھی ابھی اس نے اپنی ماں کی موت کی خبر سنی ہے۔

رادھا بائی نے جلدی سے اپنی بکس کھول کر دیکھا اس میں سو سو کے دو نوٹ رکھے تھے۔ اس نے اطمینان کی ایک بھرپور سانس لی اور بوڑھیا کے کریا کرم کا انتظام اپنے سر لے لیا۔ شمشان گھاٹ پہ رات کی تاریکی میں تین انسانی سائے تھرا رہے تھے۔ ایک سایہ بوڑھیا کے بیٹے کا تھا۔ ایک رادھا بائی کا اور ایک اجنبی کا۔

بوڑھیا کی موت کے بعد وہ بہت خاموش سا رہنے لگا تھا۔ اس کے لبوں پر ہنسی کے شاداب پھول پھر کبھی کھل نہ سکے تھے۔ وہ گھنٹوں گھر میں تنہا پڑا رہتا تھا۔ ایک وقت کھالیا تو دوسرے وقت کی فکر نہیں۔ بوڑھیا تو نیلگوں آسمان کی اوٹ میں جا چھپی تھی۔ لیکن اس کی موت نے اس کے اپنے بیٹے کے دل پر ایک بھاری کیل ٹھونک دی تھی جس کی تکلیف نے اُسے کہیں کا نہ رکھا تھا۔۔۔ اس کے خشک سینے سے آٹھوں پہر ٹھنڈی آہیں نکلتیں اور آنکھوں سے گرم گرم جلتے ہوئے آنسو!

جب بوڑھیا زندہ تھی وہ کسی نہ کسی طرح گرتے پڑتے کچھ نہ کچھ پکا ہی لیا کرتی تھی۔ اور بالاتفاق سے کبھی مزاج ناساز ہو بھی جاتا تو اس کے لئے رادھا بائی کا گھر تو تھا ہی۔۔۔ لیکن اب بوڑھیا کی موت نے گھر کا

شہ ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ ہوٹل میں کھانا اس کے بس کی بات نہ تھی اور وہ اب کسی طرح بھی رادھا بائی پر بار بننا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے آج کل رادھا بائی کا کاروبار بھی تیزی سے مندی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک نیا گاہک جسے حال ہی میں اس نے پھانسا تھا وہ بھی گذشتہ ہفتے اپنے وطن چلا گیا تھا۔

ان تمام باتوں کے باوجود رادھا بائی نے اس کے کھانے پینے کا انتظام اپنے پاس ہی کر دیا تھا لیکن رگِ حمیت کے بروقت پھڑ پھڑانے سے اس نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اسے اتفاق کہیے کہ تھوڑی سی دوڑ دھوپ کے بعد ہی اسے شہر کی ایک خانگی فرم میں ملازمت مل گئی۔ ستر روپے ایک آدمی کے لئے کافی تھے۔ جب پہلی تنخواہ ملی تو اس نے اپنی تنخواہ کے سارے روپے رادھا بائی کے ہاتھ میں لا کر رکھ دیئے۔ وہ اصرار کرتا رہا لیکن رادھا بائی نے ان پیسوں کو ہاتھ تک نہ لگایا۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور پلکوں پر آنسو تھرا رہے تھے۔

"کیا میں نے تمہیں کھانا کسی لالچ کے تحت کھلایا تھا۔ میں اتنی گئی گذری ہوں کہ تم سے کھانے کے پیسوں کا مطالبہ کر دوں۔ تم نے میرے متعلق یہ کیوں سوچا ہے۔ بولو ——" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند موٹے موٹے قطرے گر کر زمین کی خشکی میں جذب ہو گئے۔

"تم ان روپیوں سے اپنے لئے نئے کپڑے سلوا لینا۔ میرا ہاتھ آج کل تنگ ہے ورنہ میں اس میں مزید دو روپیے شامل کر دیتی۔ تم کتنے عجیب لڑکے ہو۔ فیشن کا تو تمہیں ذرا بھی خیال نہیں۔ نہ بال ہی ٹھیک سے سنوارتے ہو اور نہ پوڈر ہی لگاتے ہو۔ جوان بچے ایسے نہیں ہوا کرتے۔ آج کل کے بوڑھے بھی فیشن کرتے ہیں۔ پھر تمہیں جلد ہی شادی بھی تو کرنی ہوگی! —"

رادھا بائی کے چلے جانے کے بعد کئی نکی گرہیں اس کے دماغ کے ستون پر آ کر کھلتی گئیں اور اس کے دل میں حرارت کے تیز فانوس جل اٹھے۔ وہ آہستگی سے اٹھتا ہوا بغل والے کمرے میں آیا جہاں طاق میں ایک ننھا منا سا خوبصورت شیشہ چمک رہا تھا۔ اس نے شیشے میں اپنے چہرے کو دیکھا واقعی اس کے بال ٹھیک سے جمے ہوئے نہیں تھے۔ اور چہرے پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ وہ آج کل کے نوجوانوں سے کتنا مختلف تھا۔ نہ دوست نہ احباب نہ ہنسی اور نہ مذاق۔ رادھا نے سچ ہی تو کہا تھا۔ آج کل کے بوڑھے بھی تو ڈریسنگ پر جان دیتے ہیں۔ خوبصورت لباس پہنتے ہیں۔ چہرے پر اسنو ملتے ہیں۔ اور اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہی انیس بیس برس۔ اس کے دماغ میں خیالات کی ایک فوج سی گھس آئی۔ اور وہ بوجھل دماغ کو لئے ایک تحت گھر سے نکل پڑا۔

شام ہو گئی تھی۔ بڑے بازار کی چوڑی چکلی سڑکوں پر لوگوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا۔ گرین ریسٹورنٹ کے سائن بورڈ پر کئی ننھے ننھے خوبصورت بلب جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چند اینگلو انڈین عورتیں گرگابی پہنے ہاتھ میں مور کا چھوٹا سا خوبصورت پنکھا لئے سڑک سے گزر رہی تھیں۔ دو امریکی نوجوان

چوراہے پہ کھڑے ہو کر فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے لاغر و نحیف بھکاریوں کی تصویریں لے رہے تھے۔ دونوں کے ہاتھ میں دو خوبصورت کیمرے تھے اور ان گنت لوگ ان کے درمیان ایک حلقہ بنائے کھڑے تھے وہ اپنی دھن میں مست بغیر کسی طرف دھیان دیئے آگے بڑھ گیا۔

جب وہ رات گئے گھر لوٹا تو اس نے ایک نوجوان کو رادھا بائی کے گھر میں دبے پاؤں داخل ہوتے دیکھا۔ عموماً جب رادھا بائی کے ہاں کوئی نیا گاہک آجاتا تو مصلحتاً اس کے گھر جانے سے گریز کرتا تھا۔ ابھی وہ بستر پہ لیٹا ہی تھا کہ اس کے کانوں میں رادھا بائی کی ہنسی کی کھنک اور نوجوان کی کھسر پھسر کی پھوار سی آپڑی۔ اس کا دل کسی غیر شعوری جذبہ کے تحت دھک دھک کرنے لگا۔ اس کا دل بے اختیار چاہا کہ ان دونوں کی مکمل باتیں سُنے۔ اس خیال نے اسے تھپکی دی اور وہ جھٹ بستر سے اٹھ کر آنگن میں آیا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کمرے میں کی پرانی کرسی نکالی اور رادھا بائی کی دیوار کے قریب لاکر کھڑی کردی۔ اور اس پہ چڑھ کر دونوں کی باتیں سننے لگا اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ فضا کے ذرہ ذرہ میں اندھیرا گھس گیا تھا۔ اس نے دیوار کے ذرا اور قریب اپنی کرسی کھسکا لی۔ لیکن اس کی سمجھ میں ایک بات بھی نہ آئی۔ وہ تھوڑی دیر کرسی پہ یونہی کھڑا رہا۔ پھر جھنجھلا کر وہاں سے کرسی ہٹالی۔ جب اس نے اپنے بستر پہ آکر دوبارہ کوشش کی تو اس کا دل طوفانی سمندر کے مدوجذر کی طرح کانپ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کے ذہن سے کثیف خیالات کے بادل چھٹ گئے تو اُسے اپنی کمینگی کا احساس ہوا۔۔۔ رات کے اندھیرے میں کسی کی پوشیدہ باتیں سننے کے لئے دیوار سے کان لگائے کھڑے ہونے سے زیادہ اور کوئی اخلاقی گناہ ہوسکتا ہے؟ اس نے دل ہی دل میں شرمندگی سی محسوس کی۔ رادھا بائی نے اس پہ کتنے احسانات کئے تھے۔ اس کی بے لوث محبت اس کے شامل حال نہ ہوتی تو وہ کب کا مر چکا ہوتا۔

رادھا بائی نے کبھی اسے اپنے گاہکوں کی زندگی کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ وہ کون ہیں کیا کرتے ہیں۔ جب تک بڑھیا زندہ تھی۔ رادھا بائی ہنسی ہنسی میں اپنے سارے راز اس سے کہہ دیا کرتی تھی۔

صبح میں رادھا بائی نے اپنے تازہ آئے ہوئے گاہک کو ناشتہ کرا کے رخصت کیا۔ رادھا بائی کے ہاں پہلی رات گزارنے والے کے لیے یہ مشکل تھا کہ وہ دوسری رات نہ گذارے۔

رادھا بائی کا یہ خاصہ تھا کہ جب کوئی نیا گاہک اس کے ہاں رات گزارتا تو وہ اسے خوش کرنے کے لئے صبح اٹھتے ہی نہا دھو کر کچن روم میں چلی جاتی اور اس کے لئے عمدہ سا ناشتہ بنالاتی ــــ یہی وجہ تھی کہ آئے ہوئے گاہک مشکل ہی سے رخصت ہو پاتے۔

صبح اس نوجوان کو رخصت کرنے کے بعد وہ بوڑھیا کے بیٹے مدن کے ہاں آئی۔ اس کے

ہاتھ میں کھانے کی کشتی تھی۔ ایک چھوٹے سے کانچ کے
خوبصورت کٹورے میں قیمہ تھا اور ایک کانچ کی پھولوں
والی رکابی میں کھچڑی ——

"ذرا دیر ہو گئی ہے کوئی خیال نہ کرنا۔ مہا جلدی
جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا" رادھا بائی نے زیرِ لب
مسکراتے ہوئے کہا اور کھانے کی کشتی اس کے سامنے
رکھ کر چلی گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد اس نے کھانے
کے لئے ہاتھ اٹھایا تو اسے یوں لگا جیسے یہ کھانا نہیں
زہر ہے۔ اور وہ مدت سے اس زہر کو امرت سمجھ کر
پی رہا ہے۔ اس کی مدت سے سوئی ہوئی غیرت نے
یکبارگی کروٹ لی۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ کوئی رات
کے اندھیرے میں اپنی عصمت کی سجی سجائی دوکان
کا نیلام کرے اور وہ صبح میں بڑی شان سے آئے
ہوئے نوٹوں کا حصہ دار بن جائے

اس کا دل چاہا کہ فوری رادھا بائی سے بات
چیت بند کر دے۔ لیکن جب اس کی نگاہ یکبارگی
طاق میں رکھے ہوئے کوکونٹ آئیل کے شیشے پر گئی
تو اس کا سر احسانوں کے بوجھ تلے جھک گیا۔

روز رات گئے اسے رادھا بائی کی کھنکتی
ہوئی ہنسی کی جھانجھیں سنائی دیتیں۔ اور اس کے
دل کے صاف و شفاف آئینہ پر گھنگھرو سے بج
اٹھتے۔

رات کو جب رادھا بائی کے کمرے سے نقرئی
ہنسی کی آواز کھنکتی تو اس پر ایک عجیب سی کیفیت
طاری ہو جاتی تھی۔ اسے اپنا بستر یوں لگتا جیسے وہ
کانٹوں کی سیج ہے جس پر وہ مجبوراً کروٹیں لینے کیلئے
چھوڑ دیا گیا ہے۔

جب صبح کی پہلی نرم و نازک کرن اس کے کمرہ
کی کھڑکی کے قریب سرگوشیاں کرتی تو وہ آہستہ آہستہ
خواب کی حسین وادی سے پرے جھانکتا اور اُسے
محسوس ہوتا جیسے اس کی بوجھل آنکھوں پر کئی ڈراؤنے
خواب کے ٹکڑے آ پڑے ہوں۔

وہ رات کو روز نیند میں بڑبڑاتا۔ "رادھا تم
مجھے چھوڑ دو۔ میں ایک شریف نوجوان ہوں، میں تباہ
ہو جاؤں گا۔ میں برباد ہو جاؤں گا —— آخر میں نے
تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ بولو۔"

اس کے بڑبڑانے چیخنے کی آواز کے ساتھ ہی
رادھا کی ہنسی رک جاتی اور اس کے چہرے کے
خطوط پر گھبراہٹ کی ایک لہر سی دوڑ جاتی اور اس کا
تانہ پھنسا ہوا گا یک تھوڑی دیر کے لئے خلاؤں
میں گھورنے لگتا اور وہ چپکے سے اٹھ کر دروازے
کے قریب کھڑے ہوئے اس کی آواز سننے کی کوشش
میں ڈوب سی جاتی۔

جب سرد ہوا کی بے لگام لہر زور سے سیٹی
بجاتی ہوئی اس کے جسم میں سرسراہٹ پیدا کرتی تو وہ
مجبوراً اپنے کمرے میں چلی آتی جہاں اس کا یار بے تابی
سے اس کا انتظار کر رہا ہوتا۔

صبح جب وہ ناشتہ کی کشتی اس کے سامنے
رکھتے ہوئے اس کا حال پوچھتی تو وہ حیرت سے اس
کی باتیں سنتا جیسے اس نے خواب ہی دیکھا ہو۔ پھر
گذشتہ رات کے واقعات اس کے ذہن کی کھڑکی سے
دبے دبے جھانکتے اور انھیں یکجا کرتا تو اسے موہوم
طور پر محسوس ہوتا جیسے اس نے رات جاگتے میں گذاری

ہے۔

جب اس نے شیشے میں اپنے چہرے کا جائزہ لیا تو اس کا دل دھک سا ہو کر رہ گیا۔ وہ خاصا دبلا ہو گیا تھا۔ وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو ملتا ہوا آنگن میں آ بیٹھا جہاں دھوپ کی گرم گرم شعاعیں زمین پر پڑ رہی تھیں۔

ابھی وہ دھوپ میں نہا ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں نے ایک زوردار طمانچے کی آواز سنی اور پھر ایک موٹی موٹی گالیوں کے ساتھ ایک شور سا بلند ہوا۔ آج خلاف معمول اپنے یار کی شان میں مغلظات بک رہی تھی۔ اور جواباً اس کے یار نے چپ سادھ لی تھی۔

اسے آنگن میں بیٹھے بیٹھے یوں لگا جیسے رادھا بائی نے اسے طمانچہ ہی مارا ہو۔

دن رینگتا ہوا ڈھل گیا۔ جب رات آئی تو اسے کافی بخار چڑھ آیا وہ بڑی دیر تک کراہتا رہا۔ پھر اس نے رادھا کو آواز دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی کمزور آواز رادھا کی دیوار پھاند نہ سکی۔

وہ ایک سایہ کی طرح کانپتا ہوا بستر سے اٹھا رادھا بائی کے دروازے کی زنجیر ہلائی لیکن جب کوئی جواب نہ آیا تو وہ مایوس ہو کر آہستہ آہستہ قدم ڈالتا ہوا بستر پر آ کر ڈھک گیا۔ رات کی تاریکی میں اس کے بڑبڑانے کی کرب انگیز آواز فضا کو سوگوار بنا رہی تھی۔

دوسرے دن صبح ہی صبح رادھا بائی کے گھر سے اس کے اشنان کرنے کی آواز آ رہی تھی مسلسل مقدس منتر پڑھتی جا رہی تھی۔ جب وہ نہا چکی تو اس کے گھر آئی۔

اسے بستر پر نڈھال سا پڑا دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"آج میں کاشی جا رہی ہوں اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتی"۔ وہ بولی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ اور وہ بستر پر پڑے پڑے ایک بے جان بت کی طرح رادھا بائی کے چہرہ کو گھور رہا تھا۔

جب رادھا بائی نے اس کے گالوں کو محبت سے تھپتھپایا تو اسے یوں لگا جیسے وہ آج کاشی نہیں جا رہی ہے بلکہ وہ خود اس کی ذات کو الانگتا پھلانگتا تیزی سے کاشی کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے!!

بقیہ جبلتوں کی ملکہ جمالیاتی جبلت

کہ آرٹ کی چیزیں اس لئے زیادہ دیرپا ہوتی ہیں کہ ان میں جمالیاتی ذوق کی تسکین پنہاں ہوتی ہے۔ اور سائنس اور فلسفہ کی اقدار اس لئے بدلتی ہیں کہ اس میں جمالیاتی ذوق کی تکمیل کے لئے سامان سے بحث ہوتی ہے اور چونکہ تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی دریافت کے طریقہ کار میں روز بروز اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے سائنس اور فلسفہ کی بدلتی ہوئی اقدار کے ارتقا میں بھی جبلتوں کی ملکہ جمالیاتی جبلت کی ہی حکمرانی ہوتی ہے

اندازِ بیاں اور

(غالب کی روح سے بغیر کسی معذرت کے)

آبرو کیا خاک اس گُل کی جو گلشن میں نہیں
لاکھ بلواتا ہوں۔ آتیں میرے آنگن میں نہیں

اے جنونِ عشق مجھ کو اُن پہ غصّہ آ نہ جائے
جان بن بن کر وہ آتیں کیوں میرے تن میں نہیں

دیکھ لوں گا ایک سن میں بے حجابانہ انھیں
چھید ان کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کھیت میں گیہوں پھٹکنے بھی نہیں آئی وہ کیوں؟
کوئی پوچھے اس سے کیوں وہ برق خرمن میں نہیں

میں کھڑا ہوں اس کی کھڑکی کے تلے دل تھام کر
آج وہ "برقِ تپاں" "آغوشِ چلمن" میں نہیں

مرمریں گردن کی رعنائی میں ہے بس یہ کمی
بازوؤں کے ہار میرے ان کی گردن میں نہیں

آ گئے پیچھے میں تیرے پھرنے لگا دیوانہ وار
بات جو تجھ میں ہے ظالم تیری سوکن میں نہیں

راجہ مہدی علی خاں

غزل

آگ سی دل میں کہیں ہو تو غزل ہوتی ہے — وہ ذرا اور قریں ہو تو غزل ہوتی ہے

دل محبت کا امیں ہو تو غزل ہوتی ہے — عظمتِ سوزِ یقیں ہو تو غزل ہوتی ہے

ہنستے پھولوں کی طرح ان کی جوانی کی طرح — فکرِ شاداب حسیں ہو تو غزل ہوتی ہے

ایک اک زخم ترا پیار کا ارماں بن کر — نکہتِ گل کا امیں ہو تو غزل ہوتی ہے

آسمانوں سے پرے سایۂ گیسو میں ترے — میرے خوابوں کی زمیں ہو تو غزل ہوتی ہے

ایک تخلیقِ گلستانِ مسرت کا خیال — خارزاروں کے قریں ہو تو غزل ہوتی ہے

بادلوں سے کبھی گلنار درختوں سے کبھی — جھانکتا چاند کہیں ہو تو غزل ہوتی ہے

دیدۂ دل کی فسوں کار جواں راہوں میں — ساتھ وہ ماہ جبیں ہو تو غزل ہوتی ہے

یا تو نظروں کا تصادم بنے وجہِ تخلیق — یا کوئی تازہ زمیں ہو تو غزل ہوتی ہے

جلوہ خود اپنی جگہ ایک کشش رکھتا ہے — سامنے کوئی حسیں ہو تو غزل ہوتی ہے

ہاتھ پھیلائے ہوئے رات کے سناٹے میں — صبحِ فردا کا یقیں ہو تو غزل ہوتی ہے

رات بھر وقت کے آئینۂ غم میں بھی ندیم
عکسِ رخسارِ حسیں ہو تو غزل ہوتی ہے

خیرات ندیم

ایک ریڈیائی تقریر

شاعر کا کلیدی منصب سماج میں

مغنی تبسم

مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنی تقریر کی ابتدا ایک کلیہ سے کروں۔ مجھے ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کوپ لینڈ Copeland کے اس محتاط بیان کا بھی اضافہ کرنا چاہئے کہ کسی کلیہ یا عام اصول پر اعتماد نہ کیجئے بشمول اس کلیہ کے"۔ تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ ابلاغ کی صلاحیت انسان کو قدرت کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔ اور لکھا ہوا لفظ ابلاغ کا سب سے طاقتور ذریعہ ہے۔ بالخصوص وہ لفظ جسے شاعر استعمال کرے نہ صرف انسان کی ناگزیر ضرورتوں کا اس کے گہرے جذبات، اس کی خواہشوں اور امیدوں اس کے خوابوں اور اس کے اندیشہ و وہم کو پیش کرتا ہے۔ بلکہ وہ بدلتی ہوئی دنیا اور اپنے زمانے کی تہذیب و معاشرت کا عکاس بھی ہوتا ہے۔ آج سے پہلے مادے کی غیر محدود توانائی کے طبعی تغیرات فطرت کا خاموش دل بنے ہوئے تھے۔ زمانۂ حال میں ان تغیرات کے بارے میں نئے انکشافات سے خود انسانی فطرت میں زبردست تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔

انسان کی داخلی زندگی جو حقیقت میں خارجی ماحول کا عکس ہوتی ہے۔ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے اور چونکہ فن ہمیشہ فطرت کا آئینہ دکھاتا ہے اس لئے تمام فنی اظہارات میں الجھاؤ پیدا ہو

رہا ہے۔ ہمارے زمانے کا ادب اور خاص طور پر شاعری روایت اور تقلید سے آزاد ہو کر نئے تجربوں اور احتجاج کی انتہا پر پہنچ گئی ہے۔

سارے یورپ میں علیحدگی پسندی، حقیقت سے گریز اور مزاج کا جذبہ ابھر رہا ہے۔ امریکہ میں "نئے وحشی" یا (Beatniks) کے نام سے ایک گروہ پیدا ہوا ہے۔ وہ ایسی چیزیں شائع کرتا ہے جو ماضی اور حال دونوں کو رد کرتی ہیں کیونکہ وہ ان کے نزدیک بے معنی ہیں۔ اپنے ایک اعلان نامے میں وہ کہتے ہیں کہ "انسان ان قدروں سے کٹ چکا ہے جنھوں نے اسے تاریخ کا بہیر دبا کر اس کے تصور کو سہارا دیا تھا۔ اب وہ سمٹ کر ایک حقیر اور غیر اہم وجود میں تبدیل ہو گیا ہے۔ ان کے نزدیک ہمارا اس دنیا میں مذہب اور اخلاق، شادی کا ارادہ اور ترقی کا تصور بہت ہی مضحکہ خیز باتیں ہیں جس کے بارے میں آسکر وائیلڈ نے ایک بار لکھا تھا کہ وہ ہر چیز کی قیمت جانتی ہے لیکن کسی بھی قدر سے واقف نہیں ہے۔" ایسے فراریت پسند اپنے سامنے کوئی مقصد نہیں رکھتے جس کے حصول کے لئے وہ جدو جہد کریں۔

دنیا میں ان کا کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی ان کے دل میں کوئی ایسی امید ہے جو بر آئے۔ ان کے لئے زندگی صرف چند مقاصد کے اجتماع وقتی ہیجانات اور عدم ترتیب کا نام ہے۔ ان میں زندگی سے بے تعلقی سیاست یا سماجی بھلائی کے کاموں میں حصہ لینے سے گریز اور ایک عام غیر ذمہ داری پائی جاتی ہے۔ جو اس تہذیب کا جواب ہے۔ جسے وہ قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں جیسا کہ مشہور شاعر اے۔ ای۔ ہاؤس من" .A.E Housman نے لکھا ہے۔ "وہ اجنبی ہیں اور ایک ایسی دنیا میں جو ان کی بنائی ہوئی نہیں ہے، خود کو خوف زدہ محسوس کرتے ہیں۔" موجودہ زمانہ میں ان خیالات کا اظہار اس شاعری میں بکثرت کیا گیا ہے۔ جو غم و غصہ، شکایت اور شکست خوردگی کا شکار ہے۔ تاہم انگلستان میں اور امریکہ میں بھی جدید شاعری کا بڑا حصہ اس کے بالکل ہی برعکس رجحان کا آئینہ دار ہے۔ یہ رجحان ہے سماجی ذمہ داری کے ساتھ ہئیت اور موضوع کی پابندی کا۔

شاعر کے اور کاموں سے قطع نظر اس کا سب سے بڑا کار منصبی یہ ہے کہ وہ بدنظمی میں ایک ترتیب پیدا کرے اور انتشار کو آہنگ بخشے۔ زندگی سے نفرت کرنا لاحاصل ہے۔ بیزاری، موت کی خواہش اور دنیا سے نفرت کا نتیجہ، غصہ اور بے حسی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ دنیا سے اس کا رشتۂ محبت اٹوٹ اور استوار ہو۔ شعر گوئی ایک ایسا عمل ہے جو گہرے عقیدے اور حیرت و استعجاب پیدا کر یقین سے وہ نما ہوتا ہے۔ البرٹ شوئٹزر Albert Slhweitzer کے الفاظ میں شعر زندگی کے احترام کی توثیق کرتا ہے شاعر نہ صرف داخلی زندگی بلکہ اس کے ساتھ خارجی زندگی کی بھی تشکیل اور تعمیر کرتا ہے۔

حقیقت کے اس انکشاف اور معرفت کا اظہار جستجو اور جس لگن کے ساتھ گرو دیو ٹیگور نے کیا ہے کسی اور نے نہیں کیا۔ اپنے مجموعۂ کلام

 [illegible]

"Fruit Gathering" کی اکیسویں نظم میں لکھتے ہیں۔ اگرچہ زمانے کے روز و شب میرے راستے کو اپنی ناکارہ گرد سے دھندلا رہے ہیں لیکن میں ایک دن اس زندگی سے ضرور ملوں گا جو مجھ میں ہے اور اس خوشی کو پا لوں گا جو میری زندگی میں ہے۔

میں نے اس کی تجلیاں دیکھی ہیں اور اس کی بے قرار سانسوں کو اپنے قریب محسوس کیا ہے جس میں میرے خیالات کچھ دیر کے لئے معطر ہو اٹھے ہیں۔

میں ایک روز اس خوشی سے ہمکنار ہو جاؤں گا جو میرے بطون میں ہے اور نور کے پردے میں مستور ہے۔ میں اس بے کنار تنہائی میں کھڑا رہوں گا جہاں تمام چیزیں اپنے خالق کی نظروں کے سامنے ہونگی"

درحقیقت یہی تخلیق کا جوہر، نفس شاعری اور لفظ کا حسن ہے۔ آخر میں لفظ کی طاقت کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے میں اپنے ہی ملک کے ایک ادیب سے رجوع کروں گا جسے لوگ صرف مزاح نگار کی حیثیت سے جانتے تھے لیکن وہ ایک خاموش اور ایک چھپا ہوا فلسفی بھی تھا۔ میرا اشارہ کلارنس ڈے ClarenceDay کی طرف ہے جس نے لفظ کی طاقت اور کتاب کے مستقل مقام کو ان جملوں میں بیان کیا ہے۔

"کتابوں کی دنیا انسان کی سب سے زیادہ ممتاز تخلیق ہے۔ اس کے سوا اس کی بنائی ہوئی کسی اور چیز کو دوام نہیں ہے۔ یادگاریں ڈھ جاتی ہیں قومیں نابود ہو جاتی ہیں، تہذیبیں پرانی ہو کر مٹ جاتی ہیں اور جب تاریکی کا ایک دور گذر جاتا ہے تو آنے والی نسلیں نئی تہذیبوں کی بنیاد رکھتی ہیں۔ لیکن کتابوں کی دنیا میں کچھ جلدیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے ایسے کئی انقلابات دیکھے اور وہ آج تک زندہ ہیں۔ اسی طرح جوان اور اتنی ہی ترو تازہ جتنی کہ اپنی تخلیق کے روز تھیں اور وہ آج بھی ان لوگوں کے قلب کی دھڑکنیں ہم کو سنا رہی ہیں جن کو مرے ہوئے صدیاں بیت چکی ہیں۔"

شاعر کا سماج میں اصل کام یہی ہے اور ہمیشہ اس کا کار منصبی یہی رہا ہے کہ وہ اپنے عہد کی تصویر بنا کر اسے آنے والوں کے لئے محفوظ کر دے شاعر مستقبل کے انسان کو یہ بتاتا ہے کہ اس کے اپنے زمانے میں انسانوں کے دل کونسی باتوں سے معمور تھے۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ حیدرآباد)

قومی دفاعی

فنڈ

میں دل کھول کر

حصہ لیجئے

مہِ تپیدہ

— سید احمد شمیم

خواب کے جزیروں کی
سیم گوں فضاؤں میں
نقرئی رداؤں میں
چاندنی کی مشاطہ
مسکراتی جاتی ہے
گنگناتی جاتی ہے
اور عروسِ گیتی کے
حسن روح پرور کو
جگمگاتی جاتی ہے
کون پھر بھی سمجھے گا؟
رات کا حسیں جوبن
دردِ دل کے ماروں کو
ناگ بن کے ڈستا ہے
دل کے زخم زاروں میں
چاند کی حسیں کرنیں
آگ سی لگاتی ہیں
قلب کو جلاتی ہیں!
ہائے کس کو سمجھاؤں!
رات خواب زاروں کی
ان حسیں نظاروں کی
زرنگار ہے لیکن
میرے دل کی گرمی سے
چاند بھی تپیدہ ہے
روح آب دیدہ ہے

شہر کی سب سے عمدہ اور پرفضا ہوٹل

مدینہ ہوٹل

حیدرآباد کا معیاری قیام گاہ

پتہ: مدینہ ہوٹل - پتھر گٹی حیدرآباد ۲

نیا اسٹاک اور اطمینان بخش قیمت

دیپک میڈیکل ہال

گورنمنٹ سرجیکل انسٹرومنٹس سپلائر

پتہ: نامپلی مارکٹ روڈ حیدرآباد ۱

حکیم سرفراز صاحب جب اپنے مطب کے
بیرونی برآمدے میں تشریف لائے تو سردی کی دھوپ
قدرے پھیل چکی تھی اور دو مریض زمین پر اکڑوں
بیٹھے ان کے لیے چشم براہ تھے۔ انہیں دیکھتے ہی
دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی سلام کے لئے
ہاتھ اٹھائے۔ حکیم صاحب نے سلام کا جواب دیتے
ہوئے اپنی برسوں پرانی میز اور کرسیوں کی طرف دیکھا

دل دھڑک اٹھا۔ اور آنکھوں میں کچھ ایسی ہی دہشت
جاگ اٹھی جیسے دو روز قبل شام کو ان کے چہیتے
اکلوتے بیٹے کی آنکھیں جیب سے چوری کرتے ہوئے
پکڑے جانے پر دہشت زدہ ہو گئی تھیں۔۔۔! ذرا
دیر کی توقف کے بعد پاس ہی پڑی ہوئی جھاڑن
سے انہوں نے ان حرفوں کو پونچھ دیا۔ اجلے ستون
پر سیاہی کے دھبے پھر بھی باقی رہے۔

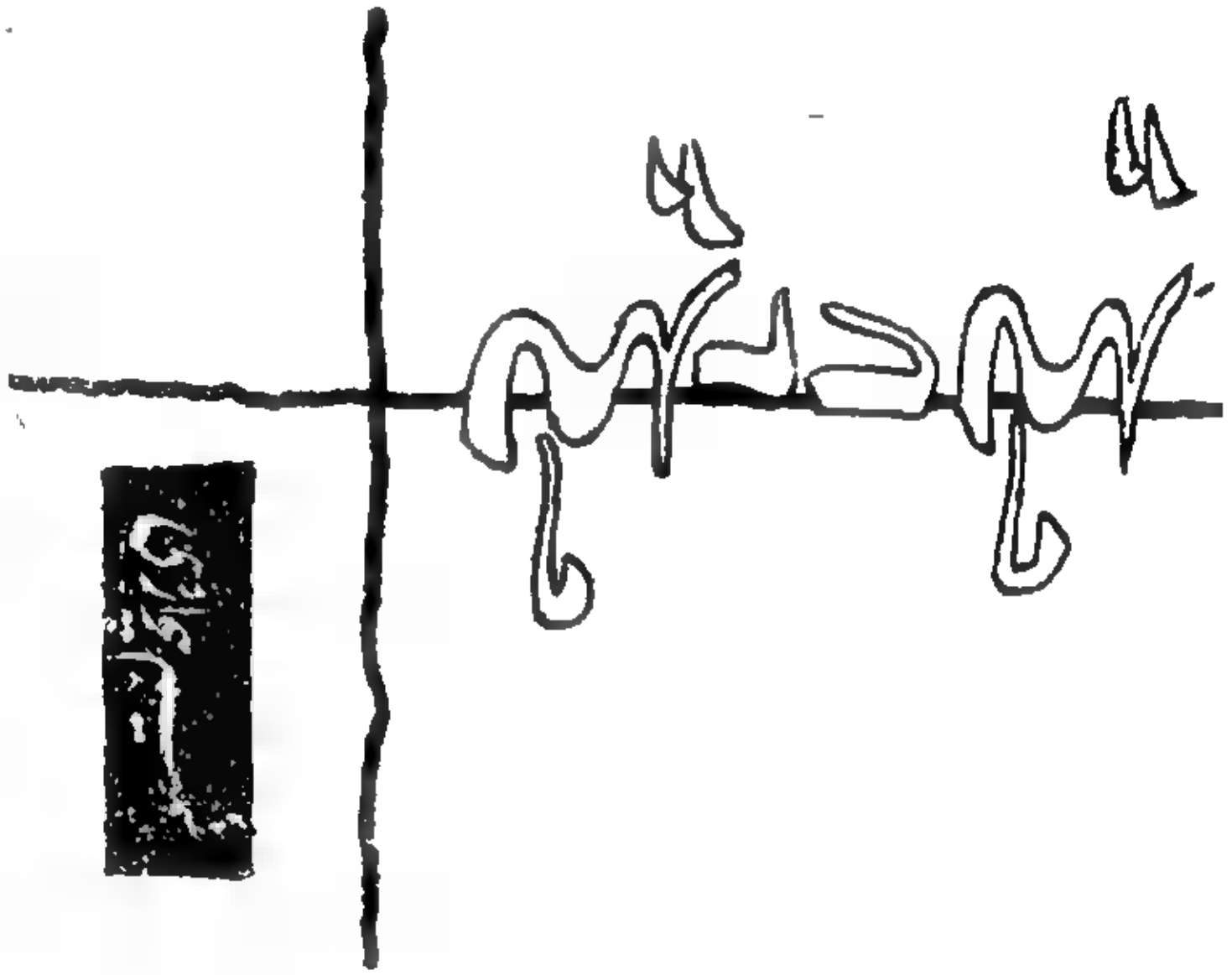

سب سے فرمانبردار بھائی دواؤں کا بکس رجسٹر
اور پانی سے بھری بوتل میز پر رکھ گیا تھا۔ وہ اپنی
مخصوص کرسی پر بیٹھنے کے لئے جیسے ہی آگے بڑھے
ان کی نظر سامنے کے گول ستون سے جا ملی۔ وہ دو
قدم چل کر ستون کے قریب پہنچ گئے۔ وہاں کوئلہ
سے جلی حرفوں میں "مجھ جیسے کا معمہ حل کیجئے" لکھا تھا
جانے کیا بات تھی کہ یکایک حکیم سرفراز صاحب کا

"کیا لکھا تھا حضور؟" ایک مریض نے دریافت
کیا۔
"کسی بچے نے شرارت سے یونہی کچھ لکھ
دیا تھا۔ کئی بار منع کیا ان لوگوں کو دیواروں پر کچھ نہ
لکھا کرو۔ مگر انہیں ذرا بھی ڈر نہیں۔ کہنے سننے کا۔
۔۔۔" حکیم صاحب بولتے بولتے کرسی پر آ بیٹھے۔ ذرا
دیر کچھ سوچتے رہے۔ اسی درمیان انہوں نے اپنی

گولڈن فریم کی عینک کے شیشوں کو رومال سے صاف کیا۔ اور پھر مریض کے احوال پوچھنے میں مصروف ہو گئے۔

شام ہوتے ہوتے یہ بات گلی کوچے، گھر آنگن بازاروں اور سڑکوں پر ایک کان سے دوسرے کان یوں گردش کر رہی تھی جیسے بھڑوں کے چھتے کو کسی شریر بچے نے پتھر مار دیا ہو اور تمام بھڑیں بھن بھن کرتے ہوئے دور دور تک منڈلا رہے ہوں۔

"انجم بھائی تمہارا کیا خیال ہے آج کے واقعہ پر؟" رمضانی کبابیے کی دوکان پر بیٹھے ہوئے حسنو نے انجم سے تبادلۂ خیال کی خاطر پوچھا۔

"یہ معمہ تو کسی طرح حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ میں تو سوچتے سوچتے تھک گیا ہوں۔ گاؤں کا ہر فرد ہاتھ پیر مار رہا ہے مگر بے حصول حتیٰ کہ سب سے ذہین اور فی البدیہہ مشکلات کا حل تلاش کرنے والا یسین بھائی کے پتے بھی کوئی بات نہیں پڑی ..... اور میں ....."

"مگر انجم بھائی معمہ حل ہو کر ہی رہے گا ایک روز ـــــ" حسنو کباب کی ایک بوٹی منہ میں ڈالتے ہوئے بولے۔ "یہ اور بات ہے کہ کچھ وقت لگے گا۔"

"ہاں! دیکھنا تو یہ ہے کہ مکھی کے چھتے سے شہد کون نکالتا ہے۔"! انجم کہتے ہوئے رمضانی کبابیے کی طرف پانی کے گلاس کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"بات کچھ بھی نہیں ہے انجم بابو۔ بے کار کی ماتھاپچی لوگ کر رہے ہیں۔ ارے کسی لڑکے نے شرارت کی ہوگی"۔! رمضانی کبابیے نے لمحہ بہ لمحہ سلگتی ہوئی کوئلے کی آگ پر تھوڑی سی راکھ چھڑکتے ہوئے کہا ـــ "بھلا بتاؤ تو چھ پیسے کا معمہ ہی کیا ہو سکتا ہے .....!!"

"تم کیا جانو رمضانی میاں۔ ابھی اس گاؤں میں تم نئے نئے آئے ہو۔ اس لئے اس گاؤں کے اسرار و رموز سے تمہیں واقفیت نہیں۔ اس گاؤں میں اگر کوئی شخص کسی گلی یا کسی گھر کے سامنے سے چھینکتا ہوا نکل جائے تو سمجھو کہ ضرور اس کے پیچھے کوئی راز ہے۔" انجم نے پانی کا ایک گھونٹ حلق کے پار اتارتے ہوئے بات کی ایڑ لگائی ـــ "تمہیں شاید نہیں معلوم چند مہینے پہلے کی بات ہے بڑی مسجد کا موذن ایک روز داروغہ صاحب کے پچھواڑے والی گلی کو عبور کر کے کہیں جا رہا تھا۔ وہیں ایک خستہ مکان کے برآمدے پر چار لڑکوں کو تاش کھیلتے اس نے دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ کیوں حسنو، تم ہی نے دیکھا تھا موذن کو مسکراتے ہوئے۔ پوچھ لو رمضانی میاں۔ یہ کوئی ماتھاپچی کی بات نہیں۔ سو فیصدی سچا واقعہ ہے پھر جانتے ہو کیا ہوا۔ ہوا یہ کہ حسنو نے دوسرے روز موذن سے اس کے مسکرانے کی وجہ پوچھی۔ موذن نے پہلے تو اپنی مسکراہٹ کو بلاوجہ بتا کر اسے ٹالنا چاہا۔ حسنو نے خوشامدیں کیں! پھر بھی وہ مسکراتا رہا۔ اور جب اس نے غیر سنجیدہ ہو کر اسے کہا۔ اگر وہ صحیح بات نہیں بتائے گا تو بڑے زمیندار سے یہ کہہ کر کہ وہ شریفوں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھتا ہے اور مسکراتا ہے اسے اس کی ملازمت سے علٰحدہ کروا دے گا۔

جانتے ہو رمضانی میاں ـــ" انجم سامنے پڑی ہوئی سیخ سے زمین کی مٹی کو کریدتے ہوئے بولا ـــــ۔

—— نوکری اس زمانہ میں انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ بلکہ یوں سمجھو کہ انسان کے جسم کی ریڑھ ہے۔ فوراً کسی سے نہ کہنے کی شرط باندھ کر یہ بات اگل دی کہ کئی روز قبل دارو غہ صاحب کے پچھواڑے والے کھنڈر میں ان چار لڑکوں میں سے تین کو اس نے ملک صاحب کی ڈائی کی جوان لڑکی کے ہاتھوں چپلوں سے پٹتے دیکھا تھا۔ چنانچہ اسی روز سے یہ تینوں لڑکے "تھری اسٹارز" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں .....؛"

"وہ تینوں لڑکے کون ہیں انجم بابو؟" رمضانی کبابیئے نے قطع کلام کرتے ہوئے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ تینوں ...."

"رمضانی میاں دو سیخ کباب کے دینا"... مولوی سید افتخار حسین حالی صاحب نے بارہ آنے رمضانی کبابیئے کی طرف بڑھاتے ایک نظر انجم اور دوسری نظر حسنو کی طرف ڈالی پھر سمٹ کر وظیفہ پڑھنے میں یوں مصروف ہو گئے جیسے انھیں ان دونوں کی موجودگی کا قطعی علم نہیں۔

"انجم کی زبان رک گئی —— اور دونوں نے یکبارگی پلٹ کر دیکھا۔ اور پھر باادب ہو کر کھڑے ہو گئے۔

"السلام علیکم مولوی صاحب"

"وعلیکم السلام" مولوی صاحب نے چھڑی والے ہاتھ کو ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔ "کیوں انجم میاں، کیا باتیں ہو رہی تھیں، ابھی کوئی خاص بات ہے کیا۔؟"

"وہی چھ پیسہ کے معمہ کے متعلق ہم لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ انجم نے بڑی متانت سے جواب دیا۔"

"ارے ہاں۔ ابھی مسجد میں بھی اسی کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ عجیب سرپھرے لوگ ہیں۔ مسجد کی بیرونی دیواروں اور کھمبوں پر جہاں تہاں یہ بات لکھ دی ہے۔ لوگوں کے لئے اچھا مذاق بن گیا ہے۔ خیر تم اپنی کہو انجم میاں۔ کیا رائے قائم کی ہے۔؟"

"ابھی تک تو کوئی خاص رائے ہم لوگ قائم نہ کر سکے ہیں۔ مگر....."

"اور نہ کر سکو گے" مولوی صاحب نے جھٹ بات کاٹی ..... "بکواس ہے یکدم سے واہیات سی بات ہے۔ بیساکھ کا مہینہ ہے اور ابھی گاؤں کے نوجوانوں کا دماغ تاڑی کے نشے میں واہیات و خرافات خیالوں کا آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں یہ کام کسی نشے باز کا ہے جسے اللہ کا خوف نہ رہا ہو ....."

"میں بھی یہی کہہ رہا تھا مولوی صاحب پر انجم بابو میری بات پر کان ہی نہیں دھرتے" رمضانی کبابیے نے دوسری سیخ سے کباب اتارتے ہوئے مولوی صاحب کے خیال کی تائید کی۔

"مولوی صاحب —" انجم نے کمال سنجیدگی سے پہلے رمضانی کبابیے کی طرف دیکھا پھر مولوی صاحب کی طرف رجوع ہوا۔ "آپ بھول رہے ہیں "روٹی اور دیپک" والا واقعہ ابھی برس بھی نہیں گزرا تب بھی ایک عنوان گاؤں کے ہر فرد کے منہ پر فلمی گانے کی طرح چڑھا ہوا تھا۔ لوگ ہنستے تھے اور

کچھ نہ سمجھ کر جھلاتے تھے۔ بکواس ہے بیہودگی ہے تاڑی کا نشہ ہے۔ مگر چند روز بعد ہی آپ نے دیکھا تھا نا کہ کسی طرح یہی بکواس ایک دلچسپ واقعہ بن کر سب لوگوں کی واقفیت میں آگئی تھی..... "

"ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے" مولوی صاحب نے جانے کیا سوچ کر مصالحت کرلی۔ "پر پیاز کے چھلکے اتارنے سے اپنی ہی آنکھیں جلتی ہیں سمجھے۔ ۔؟" اور مولوی صاحب۔ کباب کی بنڈل رمضانی کبابئے سے لے کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے چھوٹے تالاب والے راستے کی طرف بڑھ گئے۔

"سمجھتا ہوں، مولوی صاحب سمجھتا ہوں" انجم نے نفرت سے جاتے ہوئے مولوی صاحب کو دیکھا۔ مگر رمضانی میاں اس سرپھرے مولوی کو کون سمجھائے کہ پیاز کی جھانس تو اسی کی آنکھوں کو لگتی ہے جس کی آنکھوں کا پانی گدلا ہو۔ جس کی شرافت کو اندر ہی اندر دیمک چاٹ رہی ہو، وہ مجھے سمجھانے چلا ہے۔ ہُنہ۔۔! انجم بولتے بولتے جیسے کسی نیم خستہ دیوار کو پھلانگنے کے لئے کچھ سوچنے لگا۔

"پر انجم بابو۔ یہ روٹ اوور ٹل کا کیا قصہ ہے۔؟" رمضانی کبابئے نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"یہ بڑا دلچسپ واقعہ ہے رمضانی میاں" انجم نے اپنے سر کو ایک ذرا جھٹکا دیا۔ "زیادہ دن نہیں ہوئے یہی سال لگتی بات ہے۔ حکیم سرفراز صاحب کے اکلوتے لڑکے شاہد کو تم جانتے ہی ہو۔ ابھی کیا عمر ہوگی اس کی۔ یہی چودہ سال کے قریب اور کیا۔ لیکن تم یقین مانو رمضانی میاں بارہ سال کی عمر سے ہی اس کے کپڑوں اور بستروں پر داغ دھبے دیکھے گئے ہیں۔ کیا زمانہ ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب اتنی عمر میں لڑکے اپنی ماؤں اور بہنوں کے سینے سے چپک کر سوتے تھے..... ہاں تو میں یہ کہنے جارہا تھا کہ محرم کی گیارھویں تاریخ تھی۔ شام کا وقت تھا۔ حکیم سرفراز صاحب کی بیگم نے کچھ رُدّ شا اور حلوے گھر کی دائی جمیتری کو اپنے میکے پہونچانے کے لئے دئیے۔ ساتھ شاہد کو بھی کردیا۔ حیادی دائی مولا علی کے تبرک کو ہلکانہ کردے۔ اور پھر یوں ہوا کہ نالے ندی کے پل پر شاہد نے دائی کو بیٹھنے کی ہدایت کرتے ہوئے خود قریب کے ایک گاؤں میں جاگھسا۔ اس وقت ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہی شاہد ہاتھوں میں تاڑی کی ایک لبنی لے کر لوٹا۔ دونوں پل کے نیچے چلے گئے۔ صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ایک شخص رفع حاجت کی غرض سے اسی پل کے قریب سے گذرا۔ اس نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے بالکل قریب بے خبر سویا دیکھا..... گاؤں کے اکثر لوگ وہاں تاڑی پینے پلانے کی غرض سے جاتے ہیں بات ایک کان پڑی دوسری زبان پر آئی... اور پھر عام ہوگئی.....؟

"لیکن انجم بابو، وہ چھوکری جمیتری تو....؟" رمضانی کبابیہ کچھ بولتے بولتے رہ گیا۔

"ہاں ہاں کہو۔ رمضانی میاں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔؟" انجم نے اس کی جھجک کو توڑنے کی کوشش کی۔

"میں کہہ رہا تھا انجم بابو..... یعنی یہ کہ وہ

چھوکری تو .... میں نے سنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غلط بھی ہو۔ کہ وہ چھوکری شاہد کے نانا .....۔

"تم نے صحیح سنا ہے" —— انجم درمیان ہی میں بول پڑا —— سارے لوگ جانتے ہیں کہ اس چھوکری کی شب چاندنی میں نہ صرف شاہد کے نانا بلکہ اس کے سگے ماموں اور ان کے علاوہ اسی خاندان کے کئی افراد کے دم بھولے ہیں۔ —— تم نے رمضانی میاں اس کا وہ زمانہ نہیں دیکھا جب اس کے سیاہ فام جسم پر خدا کی دی ہوئی ایسی قوت کشش تھی کہ جس نے دیکھا اپنا دل اچھال دیا۔ جسے یہ بڑی خندہ پیشانی سے قبول کر لیتی۔ مہینہ دو مہینہ داشتہ کی حیثیت سے گھر میں رہتی اور پھر کوئی دوسرا گھر آباد کرتی۔ اسی طرح کتنی ہی شرافتیں مدفون ہو گئیں ... اور اب ..... یہ بھی درست ہے کہ اس باسی کڑھی میں بھوڑن شاہد ہی ڈالا کرتا ہے ......"

"اور میں سمجھتا ہوں انجم بھائی" —— حسنو نے مسکراتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا کہ "اس چھچھیسے کا معمہ" کے پیچھے شاہد ہی کی ذات ہے۔ کیوں؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے" انجم نے تائید کی۔ اور یکبارگی اس نے پلٹ کر اپنے قریب سے گزرتے ہوئے قربان کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اور جو رمضانی کیا بے، انجم اور حسنو کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ چکا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو" بولا۔ اس معمہ کا تعلق ہو نہ ہو شاہد ہی سے ہے۔ یکدم سے گیا گزرا لڑکا ہے۔ میں نے تو ایسا نالائق لڑکا کہیں دیکھا نہیں" —— انشاء اللہ دالان میں چند عورتوں کے درمیان بیٹھی ہوئی فرحت بیگم کو بھی دائی نے ریحانہ کی دادی کے خیال پر اپنی رائے دی۔ —— "خدا دشمنوں کو بھی ایسی اولاد نہ دے ..."

"نا فرحت بہو۔ لڑکوں کو کوسنے دینا اور ان کے لئے بددعائیں کرنا اپنی ہی بھول ہے۔" ریحانہ کی دادی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "سچ بات تو یہ ہے کہ لڑکا ہو لڑکی ماں باپ کی بے توجہی اور غفلت سے خراب ہوتے ہیں۔ خدا جانے آج کل کے ماں باپ کو ہو کیا گیا ہے کہ پرانے اصول اور پرانی عقل و سمجھ تو جیسے ان کے نزدیک بہتان ہو گئی ہے۔ دل و دماغ کو کیڑا لگ گیا ہے اور کیا کہا جائے جب ہی تو دن بہ دن دنیا بھر کی بیماریاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ —— ریحانہ کی دادی اماں نے اپنے سر پر آنچل کو درست کیا اور پھر مسکراتے ہوئے بولیں "اپنا بھی کیا زمانہ تھا۔ بچوں نے ذرا ہوش سنبھالا انھیں الگ کر کے دادا دادی یا نہیں تو نانا نانی کے پاس سلانا شروع کر دیتی تھی یا نہیں تو پھر خود ہی شوہر سے تنبو بانس دور سوتی۔ اپنی یکجائیگی کو کبھی ان کے علم میں آنے نہیں دیتیں۔ کیسی کیسی بندشیں تھیں کتنا پردہ تھا۔ اور اب "...... ریحانہ کی دادی اماں ذرا دیر کے لئے رکیں۔ اپنے آنچل سے آنکھوں کی کیچ کو صاف کیا۔ اور پھر بولیں "اور اب تو ایک کی کیا پوچھتی ہو فرحت بہو، چار چار بچوں کے بیچ میاں بیوی سوتے ہیں۔ اسی بے پردگی اور بے احتیاطی کے سبب بچے اپنی کم عمری ہی میں بہت کچھ جان لیتے ہیں اور بہت کچھ سمجھ لیتے ہیں ...... آج حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے بیٹے کے سیاہ کارنامے پر اندر ہی اندر آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں کڑھتے ہیں اور کبھی کبھی تنگ آ کر اپنے مرنے کی دعائیں کرتے ہیں مگر کل جب ان کے لاڈ

کسی غلط حرکت پر کوئی انگلی اٹھاتا تھا تو ان کی زبان
آگ کا لاوا برساتی تھی۔ تمہیں یاد ہے شمشاد کی اماں
وہ گالی اکوسے۔ تیرہ برس کی عمر تھی شاہد کی۔ ایک
روز اس کے سر میں درد ہوا اماں سنکر تڑپ اٹھی فوراً
جمیرتی دائی کو تیل دے کر کوٹھے پر بھیج دیا۔ شمشاد
کی اماں وہیں پر موجود تھیں، ماں بہن بیٹی اور بہو بھی
کے رہتے ہوئے اس بدنام دائی کا سر میں تیل ڈالنے کے
لئے کوٹھے پر جانا انھیں کھل گیا اور کھلنے کی بات بھی تھی۔
جن لوگوں کی آنکھیں سر پر ہوتی ہیں اور عقل پر جھاڑو پھر
جاتی ہے تو اپنا دودھ سانپ بھی پئے تو انھیں اپنے
بچے کا گماں ہوتا ہے۔ دنیا دیکھتی مگر خاموش رہتی کون
جان بوجھ کر غلاظت میں پاؤں ڈالے۔ پر شمشاد کی اماں
سے اس روز دیکھا نہ گیا اور ٹوک دیا جس کا شاہد کی
اماں کو اتنا برا لگا کہ پہروں کے گالی اکوسے کے بعد
اچھا بھلا رشتہ دشمنی میں بدل گیا۔"

"ہاں بوا، تم ٹھیک کہتی ہو۔ فرحت بیگم
گوسی والی نے تائید کرتے ہوئے مزید کہا۔ بچوں کی
اخلاقی حالت بگاڑنے میں سبب ہے کہ سراسر والدین
کا قصور ہوتا ہے۔ مہ پارہ کی شادی میں بھرتا والی
لڑکی کا قصہ ابھی تک کوئی نہیں بھولا۔ ایسی ماں پہ
خدا کی پھٹکار۔ خود تو سوتی تھی کمرے میں عورتوں کے
بیچ اور اپنی جوان لڑکی کو سلاتی اسارے پر جہاں
دوسری لڑکیوں کے درمیان ہی شاہد سویا کرتا۔ خدا
جانے کیسے اس عورت کو نیند آتی تھی۔ وہ تو گھرلی دائی
کلیمن نے دیکھ لیا جو دوسری رات سے وہ لڑکی ماں
کے ساتھ سونے لگی ورنہ اس روز انگلی ہی پکڑی تھی
دوسرے روز کچھ اور پکڑ لیتا۔۔۔۔"

"ارے بڑی اماں "سہاگ رات کا چور" والا
قصہ فرحت بھابی کو سنا دو نا۔ صفیہ اپنی گود کی بچی کو
دھیرے دھیرے تھپتھپاتے ہوئے بولی۔۔۔ شاید
انھیں معلوم بھی نہ ہو"

فرحت بیگم گوسی والی یکدم سے متحیر ہو گئیں۔

"یہ سہاگ رات کا چور کیا ہوا بوا؟"

ریحانہ کی نانی اماں کھل کھلا کر ہنس پڑیں
اور پھر فوراً سنجیدہ ہو گئیں "اخلاق اور تہذیب جن
باتوں کے دہرانے سے زبان پکڑتے ہیں آج کل کے
والدین ان ہی باتوں کو دیکھ کر چشم پوشی کرتے ہیں
جیسے یہ وقتی چیز ہو۔ شاید اس وقت دس برس کا تھا
تم اس وقت بیاہ کر آئی بھی نہیں تھیں۔ انوری کی اماں
جانتی ہیں۔ حکیم صاحب کے منجھلے بھائی کی شادی کے
عین سہاگ رات کو تو دس برس کا لڑکا پلنگ کے اندر
چھپ کر دولہا دولھن کی تمام حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔
جانے کیسے دولہن کو اندر کسی کی موجودگی کا علم ہو گیا اس نے
اندر جھانک کر دیکھا۔ چراغ کی مدھم روشنی میں وہ محض
جسم کو دیکھ سکی۔ اسے چور کا گمان ہوا۔ مارے خوف
کے وہ چور چور چلا اٹھی۔ دولہا ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا
جب تک شاہد دبے قدموں دروازے تک پہونچ کر
کنڈی کھول رہا تھا۔۔۔۔۔۔ بات ایک زبان پر آئی
اور اڑی اڑی طاق پر بیٹھی۔ ریحانہ کے باپ نے اسے کچھ
بھی نہ کہا اور مسکرا کر رہ گئے۔ ابتدائی عمر کی ایسی ایسی
ہی نفسی شرارتوں سے والدین کی چشم پوشی اولاد کو آوارہ
خیال بنا دیتی ہے۔ قصور بہرحال والدین کا ہوتا ہے۔۔"

تصور درحقیقی والدین کا ہی ہوتا ہے۔

عشق پیچاں کی بیلیں ہر نمود کے ساتھ اپنی افزائش کیلئے

اپنے نگہبان کی فنکارانہ انگلیوں کے لمس کی محتاج ہوتی ہیں اسی طرح ایک اولاد ماں کی گود کے لئے مستحق پیچان کی ہوتی ہے۔

زندگی کے آنگن میں اس پودے کی جب پیدائش ہوتی ہے تو یہ ہر دل کی راحت اور ہر آنکھ کی ٹھنڈک کا باعث ہوتا ہے۔ گھر کے تمام افراد کے التفات اور پیار اس کے نصیب میں آتے ہیں۔ چنانچہ جب شاہد نے اپنی ماں کی گود میں آنکھیں کھولیں تو خاندان کے تمام افراد نے بڑھ کر اسے چوم لیا۔ وہ گھر کا پہلوٹا لڑکا تھا۔ خوش نصیبی تھی اس کی یہ اور اس خوش نصیب اولاد نے اپنی اوائل عمری سے ہی اپنی فطری چلن کے سامنے ہر کسی کو مغلوب ہوتے دیکھا۔ شعوری زندگی میں جب اس نے قدم رکھا تو اپنے فطری چلن کو ہی اس نے والدین سے ملی ہوئی تربیت سمجھی اسی سمجھ بوجھ کے سہارے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے ارمانوں کا چراغ جلاتا رہا۔ کوئی مخالف ہوا کبھی نہ چلی۔ ہر خواہش اس کی خندہ پیشانی سے قبول کی جاتی۔

کبھی ایسا بھی ہوا کہ اس نے کسی چیز کی طلب سامنے رکھی اور وہ چیز گھر میں تو کیا گاؤں میں بھی نہ ہوتی ایسی صورت میں اس چیز کی نایابی کو بتا کر اسے بہلانے کی کوشش قطعی رائگاں ثابت ہوتی۔ پیدائشی فطرت نے اس کی فکری صلاحیت کو مجبوری، لاچاری اور اسباب کو خاطر میں لانے کے قابل رکھی ہی کب تھی! گھر میں ایک ہنگامہ رہتا اس وقت تک جب تک اس کی مانگی چیز سامنے لا کر نہ رکھی جاتی۔ زندگی اسی لاڈ و پیار میں آگے بڑھتی رہی۔ شاہد تیرہ سال کا ہو گیا۔ تب حکیم سرفراز صاحب نے اس تیرہ سال کے شاہد کے مستقبل پر غور کیا۔ ہر طرف مایوسی کے گھیرے تھے۔ تین سال سے مسلسل تیسری جماعت میں فیل ہوتا آ رہا تھا۔ اس کی بے جا شرارتوں اور نفسی غلط روی سے نہ صرف گھر کے افراد کو نقصان پہونچ رہا تھا بلکہ گاؤں کے لوگ بھی پریشان ہو رہے تھے۔ آئے دن بکس سے پیسے غائب ہونے لگے۔ تاڑی کے نشے میں دھت گئی رات کو گھر لوٹتا اور ماں بہن کے ساتھ شوخیاں کرتا ..... تب حکیم سرفراز صاحب نے اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کی۔ بکس میں تالا پڑنے لگا اس کے گھر پر پڑھنے کے لئے ایک ماسٹر کا تعین کیا۔ جمیری دائی کو گھر سے نکال دیا۔ اور خود بھی اس پر کڑی نگاہ رکھنے لگے ..... مگر چند روز کے بعد ہی انھوں نے محسوس کیا کہ اس پودے کی لتیں اور گرد پھیل کر اس طرح الجھ گئی ہیں کہ ان کی آرائش ناممکن کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اور اب یہ لتیں خود اُن کے گلے کا پھندا بن گئی ہیں۔ قوت احساس جاگی تو وقت کی بے قدری کے پے در پے کئی بھرپور طمانچے ان کے موہنہ پر لگنے اور تب گاؤں کے منچلے نوجوانوں کو ہنسنے ہنسانے اور بہلنے بہلانے کے موضوع ملنے لگے۔ کبھی یہ موضوع "دوٹ اور پل" کبھی "پنچ کا چور" اور کبھی "چھ پیسے کا معمہ" کا روپ لے کر آتا۔

"خیر یہ باتیں تو پرانی ہو گئیں۔ اب یہ ذرا نیا معمہ بھی تو حل کر دو۔ آخر ہے کیا بلا یہ۔" فرحت بیگم کوسی والی نے صحیح موضوع کو سامنے لایا۔

"حل کرنا کیا ہے فرحت بہو" اتنی دیر سے خاموش بیٹھی ہوئی شمشاد کی ماں درمیان میں بول پڑیں۔ اور تمام

عورتیں اُن کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ نہایت معمولی سی بات ہے، مگر کہوں تو کیسے کہوں۔ ڈر لگتا ہے۔ کوئی شاہد کی ماں سے کہہ نہ دے۔"

"ایسی بھی کیا بے اعتباری ہے شمشاد کی ماں" ریحانہ کی دادی اماں نے انھیں ٹوکا۔

"تم اپنے پر کیوں لیتی ہو بھابی۔ یہ تو عام بات کہی ہے جس نے دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ تم سب کچھ جانتی ہو۔ مہ پارہ کی شادی میں اس کی پہنچی غائب ہوئی تو گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ چور کو پکڑنے کے لئے نام نکلوائے گئے مگر کسی نے بے دلی سے انھیں الٹا سیدھا پڑھا کر ٹال دیا۔ یہ بات نہیں کہ کسی کے علم میں صحیح چور کا نام آیا نہ تھا۔ بات تو اس مصیبت ناگہانی سے بچنے کی تھی جو چور کا نام زبان پر آتے ہی اپنے سر پر ٹوٹنے کا امکان یقینی تھا۔ بات چھپی ہی رہتی۔ اگر شاہد کی ماں مولوی صاحب کی بیٹی پر جھوٹا الزام نہ دھرتی۔ ناکردہ گناہ کی رسوائی مولوی صاحب سے سہی نہ جا سکی۔ اور انھوں نے مسجد کے پیش امام، داروغہ صاحب، بڑے زمیندار صاحب اور اسکول کے ہیڈ ماسٹر کی موجودگی میں ایک چھوٹے سے بچے کو اپنے سامنے کھڑا کر کے اپنے ناخن پر ایک تصویر دکھائی۔ بچے نے بلا تامل اس تصویر کو شاہد کا نام دیا۔ لوگوں نے سنا خاموش ہو گئے۔ شمشاد کے ابا نے مجھ سے کہا۔ میں نے اس کا ذکر فرزانہ کی اماں کے سامنے کیا اور اس نے شاہد کی ماں سے جا کر جڑ دیا۔ ... مجھے جیسی جیسی مغلظات اور بددعائیں سننے کو ملیں وہ سارا گاؤں جانتا ہے۔" . . . .

وہ ٹھیک ہے، ابر یہاں پر جو بھی موجود ہیں میں سمجھتی ہوں کہ ان پر تم بھروسہ کرو۔ ویسے تمہاری مرضی۔" ریحانہ کی دادی اماں سب کی طرف سے اطمینان دلاتی ہوئی بولیں

"تم بے فکر رہو بھابی" فرحت بیگم کوسی والی بولیں۔ "سمجھو تم نے اپنی بات سمندر میں پھینکی ہے۔"

"تو سنو! ___ "دلشاد منزل" کی والی زرینہ ہے نا۔ مقبرے کی طرف جانے والی گلی میں شاہد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ تم جانتی ہو وہ کتنی فاحشہ قسم کی عورت ہے۔ جھٹ بول پڑی۔ ایسے نہیں۔ چھ پیسے کی مجھے ضرورت ہے۔ پان والے کو دینا ہے۔ شاہد نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ گھر آکر اس نے باپ کی جیب سے پیسے اڑانے کی کوشش کی۔ حکیم صاحب اسی وقت کسی ضرورت سے مطب کے کمرے میں داخل ہوئے۔ گھر کی والی کلثوم نے مجھے بتایا حکیم صاحب نے اسے اس روز اتنا مارا ہے کہ اس کے جسم پر داغ ابھر آئے اور پھر گھر سے نکال دیا۔ ساری رات جاڑے میں نہ جانے کہاں گذار دی۔ صبح کلثوم نے اسے گاؤں میں اسے تلاش کروایا۔ آخر قربان نے تلاش کرنے والے کو بتایا کہ اس نے شاہد کو چھوٹی درگاہ کے پاس بیٹھا ہوا دیکھا ہے۔ . . . . ."

"پر بھابی زرینہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کیا کلثوم نے ہی دیکھا تھا؟" فرحت بیگم کوسی والی نے پوچھا۔

"نہیں اس وقت میں اپنے کوٹھے پر سوکھے کپڑے سمیٹ رہی تھی۔ چشم دید بات ہے۔" شمشاد کی ماں نے جواب دیا۔

"ارے ریحانہ کی دادی اماں، تم نے کچھ سنا؟ اسی وقت کوٹھے گھر کی خالہ اندر داخل ہوئیں۔ شاہد کے

سر کے آدھے بال کسی نے تراش دئیے ہیں۔ اور بدن پر کافی چوٹ ہے۔ شاید کسی نے مارا پیٹا ہے۔ جا کر دیکھنا۔ گھر میں بھیڑ لگی ہوئی ہے ....."

"کیا کہہ رہے ہو انجم بھائی؟" دوسرے روز صبح کو بڑی درگاہ کے پاس ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے حسنو نے حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ "مجھے تو کسی طرح اس بات پر یقین نہیں آتا ....."

"میں سچ کہہ رہا ہوں حسنو گھر سے نکالے جانے کے بعد شاہد چھوٹی درگاہ کے پاس ایک خستہ مکان کے پچھواڑے میں بیٹھا رو رہا تھا۔ قربان نے اسے دیکھ لیا۔ ساری بات اس سے معلوم کی پھر اسے وہ اپنے گھر لے گیا۔ اسے کھانے کو دیا اور رات اپنے گھر میں ہی سلایا۔ پھر صبح جب وہ اس گھر سے نکلا تو بجائے گھر جانے کے چھوٹی درگاہ کے پچھواڑے میں جا کر چھپ گیا۔ قربان ہی اس کے لوگوں کو اس کا پتہ دیا تو گھر لے گئے۔ اور پھر وہ شام کو زرینہ سے ملنے مقبرے والی گلی میں گیا۔ وہاں زرینہ اسے ملی۔ اس نے اسے سامنے والے کھنڈر میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہاں پہلے سے زرینہ کا پرانا آشنا اس کی تاک میں بیٹھا تھا۔ زرینہ کے ساتھ شاہد کو دیکھ کر اسے بڑا تاؤ آیا۔ اور پھر اس نے شاہد کو وہیں پر خوب زدوکوب کیا اور ساتھ ہی اپنے چھرے سے اس کے سر کے آدھے بال تراش دئیے ......"

"مگر انجم بھائی، اس کے پاس پیسے کہاں سے آئے۔ زرینہ کو دینے کے لئے؟" حسنو نے پوچھا

"قربان نے اسے دئیے تھے۔ آخر رات بھر اسے اپنے گھر رکھا بھی تو ......"

"میں سمجھا نہیں۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو انجم بھائی؟" حسنو نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے وضاحت چاہی۔

"میں تمہیں سمجھا دوں مگر تمہیں میری بات کا یقین جو نہیں آئے گا۔ تم ایسا کرو کہ قربان سے خود پوچھ لو۔ وہ تمہارا دوست ہے نا۔ ضرور بتا دے گا تمہیں وہ ....." انجم نے مسکراتے ہوئے بات ٹال دی۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر پچھلے دامن کو جھاڑتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

فرانس کے مشہور ناول نگار
ایمل زولا
کے شہرۂ آفاق ناول
اے لو افیر
کا عکس جمیل
جسم
ایک رومانی نفسیاتی ناول
مجلد عمدہ کتابت، طباعت۔
رنگین سرورق، قیمت صرف ۲ روپیے ۸۰ پیسے
ناشر۔ ادارہ پیکر حیدرآباد ۲ ۔ م
ملنے کا پتہ :۔ کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد

بے رخی اچھی نہیں انکار رہنے دیجئے
مجھ کو محوِ گیسو و رخسار رہنے دیجئے!
طنز کے نشتر چبھو کر آپ اسے چھیڑیں نہیں
جاگ اٹھے گی فطرتِ خوددار رہنے دیجئے
آپ کو اپنے حسیں اعجازِ پنہاں کی قسم!
دل پہ میرے زخم کے آثار رہنے دیجئے
ساری دنیا کو بنا ڈالیں گے کیا دیوانہ آپ!
جتنے اب ہشیار ہیں ہشیار رہنے دیجئے
میں کہ ہوں دیوانۂ موجِ بہارِ صحنِ گل
میرے دامن میں بھی کوئی تار رہنے دیجئے
چھیڑیئے مضرابِ غم سے تارِ ہستی چھیڑیئے
زندگی کا ہر نفس بیدار رہنے دیجئے
روزِ اول ہی سے ہے ارشاد محرومِ کرم!
ہو سکے تو ظلم کیجے پیار رہنے دیجئے

عطاء الرحمٰن ارشاد

نہیں آساں دلوں سے نقشِ الفت کے مٹا لینا
کریں گے کوششیں ہم بھی ہمیں بھی تم بھلا لینا
گھٹائیں گھر کے جب آئیں یونہی گھٹ گھٹ کے رہ جانا
کبھی چمکے اگر بجلی تڑپ کر مسکرا لینا
امیدیں اپنے مستقبل کی تاریک ہو جائیں
تو دل میں یادِ ماضی کے نئے دیپک جلا لینا
فضائیں تم کو گلشن کی اگر اب بھی نہ راس آئیں
تو پھر برقِ تپاں بن کر نشیمن خود جلا لینا
جو بھڑکے آتشِ الفت رہیں سوزاں اگر تن من
تو پھر اشکوں کے پانی سے لگی دل کی بجھا لینا
نہ بہلے گر دلِ ناداں تو بھر کر سرد آہیں کچھ
بساطِ زندگانی پر نئی بازی لگا لینا
چمن دل کا اجڑنے کو خزاں کی زد میں گر آئے
نسیم خستہ تن کہہ کر کلی دل کی کھلا لینا

وحیدہ نسیم

اک اک شگفتِ گل میں ہنسی گھولتے رہے
ہونٹوں سے ہر بہار کے تم بولتے رہے
بے حس جہاں میں نالۂ غم گھولتے رہے
اس نعش کے سرہانے ہمیں بولتے رہے
ان کے نصیب میں ہی رہا تشنگی کا بن
مینائے زندگی میں جو رس گھولتے رہے
ہر شئے نسیم پیشہ و گرمِ سفر ملی
لمحاتِ وصل آئے تو پر تولتے رہے
اُن مطربانِ شوق کی کچھ داد دیجئے
جو دل کے ٹوٹے تاروں سے بھی بولتے رہے
وہ تم تھے یا تھا اور کوئی پچھلی رات میں
کچھ مہکے سائے جانبِ در ڈولتے رہے
غنچے چٹک رہے تھے مصوّر سرِ بہار
کچھ حسین بندِ قبا کھولتے رہے

مصوّر سبزواری

محمد علوی

نیند راتوں کی اڑا دیتے ہیں
ہم ستاروں کو دعا دیتے ہیں
روز اچھے نہیں لگتے آنسو
خاص موقعوں پہ مزا دیتے ہیں
اب کے ہم جان لڑا بیٹھیں گے
دیکھیں اب کون سزا دیتے ہیں
ہائے وہ لوگ جو دیکھے بھی نہیں
یاد آئیں تو رُلا دیتے ہیں
دی ہے خیرات اسی در سے کبھی
اب اسی در پہ صدا دیتے ہیں
آگ اپنے ہی لگا سکتے ہیں
غیر تو صرف ہوا دیتے ہیں
کتنے چالاک ہیں خوباں علوی
ہم کو الزامِ وفا دیتے ہیں

ٹھمری

صمد پرویز

ایک قدیم فن جو نوابوں کے زمانے میں بہت مشہور تھا

ایک قدیم فن جو نوابوں کے زمانے میں بہت مقبول تھا اور موسیقی کی یہ صنف جو کسی زمانے میں حسین اور مدھر انداز میں ٹھمری کے نام سے گائی جاتی تھی دور جدید میں اپنے اصلی اور مصدقہ فنی روپ سے منحرف ہوگئی ہے۔ پھر بھی یہ موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں میں ہر جگہ مقبول ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ٹھمری گانے کا طریقہ اتر پردیش کے مشرقی حصہ میں گائے جانے والے موسمی اور تہوار کے موقعوں کے لوک گیتوں جیسے ہولی، چیتی، ساون، کجری، دادرا وغیرہ سے اخذ کیا گیا ہے۔ بعض عالموں کی یہ رائے دلچسپ اور قابل غور ہے کہ موسیقی میں ٹھمری اور رقص کی کتھک طرز لکھنؤ کے نواب واجد علی شاہ کے دور کی پیداوار ہیں۔ بعض اس نظریہ کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے اور میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ ٹھمری بھی اتنی قدیم اور فنی ہے جتنا کہ دھمار اور یہ کہ ٹھمری اور کتھک دونوں نے اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت کو اپنی موجودہ شکل میں نواب واجد علی شاہ کے زمانہ میں پھر سے حاصل کیا۔

ہم سب جانتے ہیں کہ مشہور دھرپدیئے، برانداہن کے ہری داس سوامی (تان سین کے استاد) نے بھگوان کرشن اور رادھا کی مدح میں بے شمار دھمار تیار کئے اور گاتے تھے۔ موجودہ دور میں بھی مشہور گائیک متھرا والے چندن چوبے نے اپنے آپ کو دھمار اور ٹھمری کے لئے وقف کر دیا ہے۔

دھرو پد گائیکی کے بول زیادہ تر بھگوان شیو اور مغل بادشاہوں کی تعریف میں یا قدرت کی عظمت کے بیان پہنائے جاتے تھے اور دھمار یا ہوری کے بول بھگوان کرشن کی زندگی کی مختلف کہانیوں پر ٹھمری کی نمایاں خصوصیت اس کا جذباتی مضمون ہے جس میں بالخصوص بھگوان کرشن اور رادھا کی پریم کہانیوں کا بیان ملتا ہے۔ ٹھمری کو وشنواؤں کی موسیقی بھی کہا جا سکتا ہے۔

ماہرین موسیقی نے دھروپد کے معنی دھروا پد اور خیال کے معنی نظریہ، تخیل یا تصور بتلاتے ہوئے تفصیلی وضاحت کے ساتھ ان اصطلاحات کا بیان رقم کیا ہے۔ ٹھمری کی اصطلاح کا مفہوم ابھی تک کسی نے بیان نہیں کیا ہے۔ تاہم متعلقہ وشنوا شاعروں کی تخلیقات (بالخصوص بنگال کے کیرتن) اور روایتی ہوری، دھمار اور ٹھمری کے مطالعہ سے اس باب میں قابل لحاظ مدد ملتی ہے اور اسی سے میں نے بھی یہ یقین حاصل کیا ہے کہ ٹھمری کی اصطلاح "ٹھم" اور "ری" دو لفظوں سے مرکب ہے۔ یعنی ٹھمکا چال (یا حرکت) جو رادھا جی کی تھی اور ری فاوت (پسندیدہ اور طلب) جو بھگوان کرشن کی روح اور دماغ تھا۔ ٹھمری کے مضمون کے لحاظ سے بھی یہ تعریف بہت چست اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس عنوان پر مزید کوئی تحقیق موجود نہیں ہے، اور ماہرین موسیقی کے لئے بہت مناسب موقعہ ہے کہ وہ اس کی فنی گہرائیوں اور مضمون کی خوبصورتی کے پہلو کو بے نقاب کریں۔ بعض رجعت پسند ماہرین فن عام طور پر ٹھمری اور ٹپہ کو بھی سراسر ہلکا فن سمجھتے ہیں۔ یہ نظریہ بھی خلاف حقیقت معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ دیگر ملحوظات کے علاوہ اگر کسی صنف موسیقی یا فن کو جو وقت اور عوام کے امتحان کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے قدیم فنون کے زمرہ میں شامل کیا جاتا ہے تو پھر ٹھمری اور ٹپہ طرز کی گائیکی بھی جیسا کہ اوپر صراحت کی گئی ہے اس معیار سے گری ہوئی نہیں ہو سکتی۔

ٹھمری گانے کی خوبصورتی فنکار کی اس صلاحیت میں مضمر ہے کہ وہ گیت کے الفاظ کو موسیقی کے مختلف اسلوب کے ذریعہ مناسب اور ممکن معنی و مفہوم میں ظاہر کرے۔ ٹھمری کی روح اس کے بول ہوتے ہیں (مختلف اور مناسب کیفیات یا اس کے ذریعہ کسی لفظ کی ترجمانی اور اس کا اظہار جسے گا کر ادا کرنا مزاج اور کیفیت کا عطیہ ہے۔ اس لئے گانے سے پہلے گائیک کے لئے ضروری ہے کہ وہ گیت کے ہر لفظ پر غور کر کے اس کے خیال کی گہرائی کو سمجھے۔ اس کو ڈرامہ کے ایک حصہ کی طرح ہونا چاہئے جس کا مرکزی خیال آہستہ آہستہ ابھرتا ہے۔ اور تال و سر کے ذریعہ اظہار کرتا ہے بہ الفاظ دیگر اسے نزاکت اور فنی صلاحیت کے ساتھ گائیک کی روح کا اظہار کہا جا سکتا ہے۔

ٹھمری کے دو خاص اسلوب ہیں ایک لکھنو طرز دوسرے بنارسی طرز ساتھ ہی گیا اور پنجاب کے ٹھمری گانے کے طریقوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا کیا جانا چاہئے۔ اس صدی کے ابتدائی حصہ کے بہترین ٹھمری گانے والوں میں گوالیار والے بھیا

صاحب گنپت راؤ اور استاد معز الدین خاں گذرے ہیں۔ ان کے پیش رو ٹھمری گانے والوں میں لکھنو دربار کے قادر پیا اور للن پیا مشہور ہیں۔

ٹھمری فنی نمونہ کی ایک خوبصورت بندش ہوتی ہے۔ جہاں تک راگوں کی ترکیب اور ان کے گانے کا تعلق ہے ٹھمری کو خیال سے زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اس فن کا سیکھنا مشکل ہے۔ ہمارے بہت سے مشہور خیال گانے والے ٹھمری کو اسکی فنی خوبیوں کے ساتھ گانے میں اکثر ناکام رہتے ہیں۔

صحیح اور نمائندہ طریقہ پر ٹھمری گانے والے موجودہ نمایاں چند فنکار رسولن بائی. سدھیشوری بائی بنارس والی لکھنو کی بیگم اختر. کلکتہ کے منیر الدین خاں اور پیارے صاحب گیا والی ڈھیلا بائی پنجاب کے بڑے غلام علی خاں ہیں بنگال کے سنگیت اچاریہ گرجا شنکر چکرورتی جنکی چند برس پہلے بے وقت موت ہوگئی، بھیا صاحب گنپت راؤ اور معز الدین خاں جیسے مشہور اساتذہ کے ڈھنگ کی ٹھمری کو برقرار رکھنے اور اس کو مقبول کرنے کے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔ ٹھمریاں زیادہ تر ہارمونیم کی سنگت میں گائی جاتی تھیں جس کے ماہر بھیا صاحب گنپت راؤ گوالیار والے، سوہنی جی مہاراج گیا والے اور راجہ نواب علی لکھنو والے گزرے ہیں۔

یہ بڑی بدبختی ہے کہ مشہور موسیقاروں کی بڑی تعداد نے فن کی اس نازک اور پاکیزہ صنف کے استعمال میں اس کے مضمون کی گہرائی کا مطالعہ کئے اور خصوصیت کو پہچانے بغیر بہت نا روا آزادی سے کام لیا ہے۔ اور اس طرح اس کی حیثیت اور عظمت کو قابل لحاظ حد تک مسخ اور تباہ کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس فن کے ماہرین ایسا اقدام کریں جس سے یہ تحفظ حاصل ہوسکے کہ گانے کی اس حسین صنف کی مزید غلط ترجمانی نہیں ہورہی ہے اور اس طرح اس کے اصلی روپ اور صحیح طریقہ کی اشاعت اور حفاظت ہو تاکہ یہ فن آئندہ ترقی اور توسیع کرسکے۔

(انگریزی سے ماخوذ)

عمدہ نفیس اور سائنٹیفک طریقہ پر
تیار کئے ہوئے عینکوں کے لئے
تشریف لائیے
غوری اینڈ کو
ممتحن چشم و عینک سازاں
شاہراہ عثمانی
ترپ بازار۔ حیدرآباد۔ اے پی

حُسنِ مدقوق

لوگ کہتے ہیں کہ ہمدرد ہے حساس ہے موت
غم سے کچلے ہوئے لوگوں کے لئے آس ہے موت
جن سے دامن کو یہ دنیا بھی چھڑا لیتی ہے
موت بڑھ کر انھیں سینے سے لگا لیتی ہے

لیکن اے موت ذرا یہ بھی تو پوچھیں تجھ سے
تو نے کیوں حسن کو محصور بنا رکھا ہے
یہ سراپا، یہ تب و تاب، یہ معصوم نظر
یہ دلآویز خطوط اور یہ امنگوں کی سحر

سینۂ شوق پہ چھایا ہوا آہوں کا غبار
زیرِ خاکسترِ غم زیست کا بجھتا سا شرار
چشمِ میگوں میں ہیں پرچھائیاں ویرانوں کی
دل کے دامن میں نہاں لاش ہے ارمانوں کی

کیا یہ نظریں تری آنکھوں میں اُتر جائیں گی؟
کیا یہ زلفیں ترے شانوں پہ بکھر جائیں گی؟
کیا یونہی زیست کا عنوان بدل جائے گا
کیا یونہی غنچۂ نوخیز کچل جائے گا؟

حُسن اے موت! ازل ہی سے ہے زندہ جاوید
کون کہتا ہے کہ ہو جائے گا یہ تیرا صید!

رفعت صدیقی

جیلانی بانو آج ہندو پاک کی مقبول ترین افسانہ نگار ہیں۔ یہاں "پہلی تخلیق" کے زیر عنوان ان کی پہلی کہانی "ایک نظر ادھر بھی" شائع کی جا رہی ہے جو آج سے بارہ سال پہلے جون ۱۹۵۱ء کے ماہنامہ "چراغ" میں شائع ہوئی تھی۔ جیلانی بانو خود اس رسالہ کی ادارت میں شامل تھیں اور یہ رسالہ حیدرآباد سے شائع ہونے والے چند معیاری رسالوں میں سے ایک تھا۔

اس سے پہلے دسمبر ۶۲ء کے پیکر میں سلام مچھلی شہری کی پہلی تخلیق شائع کی گئی تھی۔ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

پہلی تخلیق

ایک نظر ادھر بھی

جیلانی بانو

جب آپ اس شرابی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرلیں اور ساڑھیوں کی دکان سے نکل کر اپنی ڈکیلی کار کو آپ کی نگاہ سے اوجھل کرنے تو ایک منٹ کے لئے صرف ایک سکنڈ کے لئے میرے پھوڑوں سے بھرے جسم پر بھی نظر ڈالتے جائیے۔

میں آپ کی آنکھوں میں بسی ہوئی خوبصورت لڑکی کی تصویر مٹانا نہیں چاہتی لیکن یہ تصویر ہمیشہ آپ کی نگاہوں میں تو نہیں رہ سکتی —————— ؟ —

یہ موٹروں میں گھومنے والی لڑکیاں اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتیں۔ مجھے ان راستوں کے پیچ و خم کا تجربہ ہے۔ یہاں میں نے ہر موڑ پر زندگی کو عریاں دیکھا ہے اور اب اس تماشے سے اکتا کر املتاس کے درخت کے نیچے گر گئی ہوں جو سڑک کو خوبصورت بنانے کے لئے لگائے گئے ہیں ان سمنٹ کی چمکیلی

سڑکوں پہ اپنی کاروں میں بیٹھے جب معزز لوگ گذرتے ہیں تو انھیں یہ سڑک بہت حسین معلوم ہوتی ہے جس کے آس پاس املتاس کے نرم پھولوں والے درخت جھوم رہے ہیں اور ان کے سائے زمین پر دھوپ کے پھول بکھیر دیتے ہیں۔ لیکن شاید انھیں یہ معلوم نہیں کہ رات کو یہاں بھکاری بسیرا بھی لیتے ہیں۔ اور انھیں موسم کے سخت تھپیڑے، درختوں کے تنے سے لپٹنے کے باوجود بھی محفوظ نہیں رکھ سکتے۔ لیکن ان موٹر نشینوں کو کبھی ان درختوں کے نیچے پناہ ڈھونڈنی نہیں پڑتی کبھی اپنے بیمار بچوں اور دم توڑتی ماؤں کے لئے آسرے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے وہ اپنے پاس بیٹھی ہوئی موسم بہار میں اڑنے والی تیتریوں جیسی رنگین عورتوں سے موسم کے وجدانی اثرات پر بحثیں کرتے گزر جاتے ہیں۔

میں اپنے ٹھکانے پر بیٹھی یہ سب دیکھتی ہوں۔ دراصل بھکاریوں کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی ہر بھکاری زندگی محور بڑی بڑی شاہراہیں، بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں اور غلیظ و تاریک گلیاں ہوتی ہیں۔ جن پر وہ پرکار کی طرح ایک دائرے کے گرد گھومتا ہے اور ایک روز چپکے سے مر جاتا ہے۔ جیسے کسی کوڑے کے ڈھیر پر جراثیم کے ساتھ جنم لیتا ہے ویسے ہی کسی کے ڈھیر پر لاکھوں جراثیم کا اضافہ کر جاتا ہے۔

اگر چوڑی شاہراہوں کے دامن میں چھپے ہوئے یہ غلاظت کے ڈھیر نہ ہوں تو یہ کریہہ منظر مخلوق جنم نہ لیتی۔ لیکن یہ باتیں میرے سوچنے کی نہیں ہیں۔ اس لئے میں کبھی ان پر غور نہیں کرتی میں اپنا ٹوٹا ہوا پیالہ سامنے رکھے چلاتی رہتی ہوں اور لوگ گذرتے رہتے ہیں۔

یہاں سے بے شمار لوگ گذر رہے ہیں اور گزریں گے لیکن میری جانب کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اکثر لوگ میرے پھوڑوں سے پھوٹتی ہوئی بدبو سے بچنے کے لئے دور ہی سے ایک آدھ پیسہ پھینک کر چلے جاتے ہیں اور اس لمحے کانوں کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی پیسہ کی آواز سننے کو ساکت ہو جاتا ہے۔ وہ پیسہ میری ڈوبتی نبضوں کو ابھار دیتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے میں زندگی کو بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔

لیکن کب تک ــــــــــ؟

اس سڑک پر میں نے گزرتے ہوئے وقت کی مدھم سرگوشیاں بھی سنی ہیں اور آنے والے وقت کی گھن گرج بھی لیکن کسی نے میری جانب توجہ نہیں دی۔

یہاں سے بادشاہوں کی سواریاں نکلی ہیں۔ اور بڑے بڑے لیڈروں کے جلوس نکلے ہیں جنہوں نے عوام کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ میرے سامنے اس چوراہے پر دو خون ہو چکے تھے۔ ایک بہت بڑے نیتا کا جو باہر کے لٹیروں کو نکالنے کے لئے اتنا باہمت ہو چکا تھا کہ باوجود دو گولیاں کھانے کے اس کے لب کچھ کہنے کو پھڑپھڑاتے رہے اور دوسرا مجو کا ــــــــ جو پہلے کبھی مزدور تھا اور مشین میں ٹانگ کٹ جانے کے بعد ہماری ٹولی میں آن ملا تھا۔ مگر مجو نے پوری پانچ گولیاں سہاریں تب کہیں جا کر وہ ٹھنڈا ہوا۔ کئی لوگ کہہ رہے تھے کہ وہ اپنوں کے ہاتھوں مر جانا پسند نہ کرتا تھا۔ کیونکہ اس لیڈر کو باہر کے لوگوں نے مارا تھا۔ اور مجو کو لیڈر کے ساتھیوں نے

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اس کی جان اپنے پیسے میں اٹکی ہوئی تھی جو کہیں نہ کہیں اس نے ضرور چھپا رکھا تھا ورنہ ایسا کمزور بھکاری جس کی ایک ٹانگ پل کے باہر کہیں خاک بن چکی ہوگی یوں فولاد کی دیوار کیسے بن سکتا تھا۔ سرکار کا بھی تو بہت نقصان ہوا ہوگا پانچ گولیاں خرچ کر کے کہتے ہیں کہ ایک گولی اتنے میں آتی ہے کہ مجھ جیسی تین جانوں کی قیمت نکل آئے۔

یہ سب لوگ رفتہ رفتہ یہاں سے گذر رہے ہیں مگر میرے ہاتھ سے لوٹا پیالہ کسی نے نہیں چھینا۔ کسی نے میری چیخوں پر کان نہ دھرا۔ اور میں آج بھی بھکارن بنی یہاں بیٹھی ہوں اور ہر راہی کو پکار کر کہتی ہوں۔

——— ؟

اور بابو صاحب ——— ایک نظر ادھر بھی ڈالنا نہ بھولئے گا۔

چند دنوں پہلے کی بات ہے جب میرا چکنا چہرہ اور تندرست جسم دیکھ کر آپ پاس سے گذرنے والی سواریوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ اکثر آپ یوں ٹکرا کر اوندھے مونہہ گرے ہیں ———

ہاں بابو صاحب کبھی کبھی کسی بھکارن میں بھی اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر بلندیوں پر نظر رکھنے والے مہا پرشوں کو نیچے دیکھنے پر مجبور کر دے۔ آپس میں ٹکرا دے۔

میں جانتی ہوں اب میرا ناسوروں بھرا جسم اور داغوں بھرا چہرہ کسی کو بھی نہیں بھاتا۔ لیکن کبھی جب رقص کرتی ہوئی سفید فام لڑکیوں میں گورے ہونے کے باوجود اگر ایک منٹ کے لئے میرا چہرہ نظر آتا تھا اور چھپ جاتا تھا تو آپ جگمگاتے ہوئے ہال سے باہر نکل کر لڑکھڑاتے ہوئے اندھیرے کی جل پری کو ڈھونڈتے پھرتے تھے۔

یہ بہت پہلے کی بات ہے اب تو وہ بلور کے جسم والی دوشیزائیں بھی نہیں کہیں آخری سانسیں لے رہی ہوں گی۔ ان کا اور میرا آغاز خواہ کچھ ہوا ہو لیکن انجام تو ایک ہی ہے۔ اب آپ کی نظر ہم دونوں میں سے کسی پر نہیں پڑتی۔ آپ ادھر سے گذرتے ہیں تو ناک پر رومال رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے کسی شریف گھرانے میں جنم لیا۔ ماں باپ کا پیار دیکھا بہن بھائیوں کے ساتھ اسکول گئیں اور ایک دن انھیں معلوم ہوا کہ ان کا باپ ایک ہزار قرض چھوڑ کر مر گیا۔ اور اب ان کے چھوٹے بھائی بغیر فیس کے اسکول نہ جا سکیں گے۔ اور ان کی بہنیں بھوک سے بیتاب ہیں اور دنیا میں کوئی ذریعہ معاش نہیں رہا ہے اور آپ کی جیبیں روپیوں سے بھری ہوئی ہیں، آپ کی کار میں ٹفن باسکٹ لذیذ پھلوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور آپ خود بھوکے ہیں ——— پھر آپ دونوں اپنی بھوک مٹانے لگے ——— ان کی آنکھوں میں تہذیب و تمدن کا غرور تھا۔ ان کی پیشانیاں اپنی پوزیشن سے دمکتی تھیں۔ ان کی قیمتیں مجھ سے کئی گنا زیادہ تھیں۔ ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سینما ہاوز میں گھومتے ہوئے آپ فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ہاتھ آئی تھیں لیکن اب ان کے جسموں کے ناسور بھی میری طرح نمایاں ہیں ———

بی بی جی بھگوان آپ کا بھلا کرے۔ اس بھکارن پر ایک نظر ڈالتی جاؤ۔ پرماتما آپ کی جوڑی سلامت رکھے۔

سچ مچ آپ مجھے دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہیں۔ آپ کی ساری کا چمکتا ہوا بارڈر ناگن کی مانند آپ کے خوبصورت پیروں میں الجھ جاتا ہے تب آپ کے شریک حیات آپ کا ہاتھ پکڑ کر مجھ سے دور لئے جاتے ہیں کیونکہ مجھ سے آپ کا دور رہنا ہی اچھا ہے اس مصلحت کو آپ کے سرتاج اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے بھی خیال آتا ہے کہ بھگوان نے آپ کو بیگم اور مجھے بھکارن کیوں بنایا؟ مگر پھر میں توبہ کرتی ہوں میں بھی کتنی پگلی ہوں۔ یہ سب تو بھگوان کی مصلحت ہے اس میں بھکارن کا کیا دخل ——

—— ؟

بھگوان کی مصلحت۔ حکومت کی مصلحت سوسائٹی کی مصلحت۔ یہ سب مہذب سماج کی مصلحتیں ہیں۔ ان کے وضع کئے ہوئے قانون ہیں جن کے نیچے میں پس رہی ہوں۔ میں ہمیشہ بھکارن ہی بنی رہوں گی۔ بھکارن کے پیٹ سے پیدا ہوں گی اور بھکارن کے روپ میں مروں گی۔ آپ بیگم ہیں اور ہمیشہ بیگم ہی رہیں گی بھلا بیگم اور بھکارن کا کیا میل —— ؟

سیٹھ جی۔ سیٹھ صاحب۔ ایک نظر ادھر بھی تو ڈالئے۔

آپ تو بڑے دیالو ہیں نا۔ خصوصاً بھکارنوں پر بڑا ہی ترس آتا ہے۔ جب سڑک پر میری آواز سنتے مجھے تو اپنی کار روک دیتے تھے۔ مجھے معلوم ہے اس وقت آپ کو کتنے ضروری کام ہوتے۔ کاروباری آدمیوں کا تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے لاکھوں کا لین دین کرنا تو آسان نہیں۔

آپ ہر چیز خریدنے کی استطاعت رکھتے ہیں سونا، چاندی۔ دماغ۔ حکومت۔ عورت۔ عوت سوسائٹی ہر چیز آپ نے اپنی کوٹھی میں مقفل کر رکھی ہے۔ جس کی چابی آپ کے سینے میں جھول رہی ہے۔ اس پر بھی آپ بھگوان کو نہیں بھولے جو انسان صبح سویرے اٹھ کر پہلے دان دے جو راہ چلتی بھکارن کو دیکھ کر اپنی کار روک لے اور بھکاریوں سے زیادہ بھکارنوں پر ترس کھائے۔ وہ کتنا خدا ترس ہوگا ——

آج کل تو آپ ہم پر بے حد مہربان ہیں۔

کہتے ہیں پرسوں ایک جلسے میں فاقوں سے مرنے والوں پر تقریر کرتے ہوئے آپ پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ ممکن ہے آپ نے سوچا ہو۔ بھوک سے مرنے والوں کو آنسو دے کر آپ کچھ گھاٹے میں نہیں رہیں گے بہ نسبت اناج کے وہ دانے لٹانے کے جو آپ کی کوٹھی کے تہہ خانوں میں بھرے ہوئے ہیں اور ہر دانہ ایک چمکتے ہوئے سکے میں بدل سکتا ہے۔

او بڑے بالوں والے بابو۔ ادھر بھی کچھ —— خیر نہ سہی۔ مجھے تم سے شکایت نہیں ہے میں اس سڑک سے ہر گزرنے والے شخص کو جانتی ہوں میں تمہیں بھی جانتی ہوں جو میری طرح سڑکوں پر ہاتھ پھیلا کر بھیک نہیں مانگ سکتے ننگے پیر نہیں پھر سکتے کیونکہ تم ابھی ابھی کالج سے نکلے ہو تمہاری جیب میں ماں باپ کی عمر بھر کی کمائی سے خریدی ہوئی ڈگریاں پڑی ہیں اور آفسوں کے دروازوں پر (No vacancy) بورڈ آویزاں ہیں مدتوں سے کام کرنے والے کلرک بھی باہر ڈھکیلے جا رہے ہیں اور اپنی فائیلوں کو یاد کر کے یوں رو رہے ہیں جیسے عین شادی کی رات ان کی محبوبہ رقیب کی گود میں چلی گئی ہو۔

اب تمہیں معلوم ہوا کہ یہ وقت سندیں حاصل کرنے کی بجائے آفیسروں کی خوشامد کرنے یا پھر کسی عہدہ دار کا سالا یا داماد بننے میں صرف کرنا چاہئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا اور اب اس غلطی کی پاداش میں تم سڑکوں پر یوں دوڑتے رہتے ہو جیسے کسی مزدوری کا کام پوچھا ہو حالانکہ تم ابھی اتنی ہی تیزی سے واپس چلے جاؤ گے کیونکہ تمہیں ناکام بنانے کی سازش ہو چکی ہے۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تم مجھے ایسی نظروں سے دیکھتے ہو جس میں ندامت و مجبوری ہوتی ہو تمہیں دیکھ کر مجھے اس روشن صبح کا یقین ہو جاتا ہے۔ جس کا مجو یقین دلایا کرتا تھا مجھے دیکھ کر تمہارا ہاتھ خالی جیب میں جا کر واپس لوٹ آتا ہے۔ اور تم آنکھوں میں معافی مانگتے ہوئے واپس چلے جاتے ہو۔

مگر تمہیں مایوس نہ ہونا چاہئے بابوجی جینے کے لئے کچھ تو امیدیں ہوں کچھ تو سہارے ہونا چاہئیں۔ جنھیں پکڑ کر ہم آگے بڑھ سکیں۔ مجھے دیکھو میں یہاں بیٹھی ہر وقت سپنوں کا جال بنتی ہوں اگر میں ایسا نہ کروں تو آج ضرور پاگل ہو چکی ہوتی۔

مجو بھی یہی کہتا تھا۔ بیچارہ بڑی اچھی اچھی باتیں کرتا تھا۔ پچھلی بار جب مزدوروں نے ہڑتال کی تو وہ یونین کے جھنڈے کی حفاظت کرتے ہوئے کام آیا۔ حالانکہ اب وہ مل کا مزدور نہیں بلکہ ایک لنگڑا فقیر تھا۔ مگر پھر بھی وہ مزدوروں کے جلسوں میں بڑے چاؤ سے شریک ہوتا تھا جیسے اس کی کٹی ہوئی ٹانگ کی قیمت ایک روز ضرور مل جائے گی۔

جب وہ کہتا کہ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب ساری دھرتی پر عوام ہی حکومت کریں گے جب منی کے سوکھے مارے بچے کو دودھ مفت ملے گا جب بڑھے رامو کی کھانسی کا علاج ضرور دریافت ہوگا۔ جب میرے رستے ہوئے پھوڑوں کے لیے دوائیاں آ جائیں گی۔ اور دنیا میں ڈھونڈھنے سے بھی کوئی بھیک مانگنے والا نہ ملے گا تو ہم سب ہنس پڑتے۔

مزدوروں سے سنی سنائی باتیں جب وہ بھکاریوں کے اڈے پر بیٹھ کر کہتا تو ذرا دیر کو سچ مچ سب سپنوں میں کھو جاتے۔ جیسے میرے آگ سے پھنکتے ہوئے جسم پر برف کی ڈلیاں رکھ دی گئی ہوں، رامو کی کھانسی تھم گئی ہو۔ اور ہم سب ایسے بچھونوں پہ بیٹھے ہوں جن کے گدگدے روؤں میں پاؤں دھنس دھنس جائیں ——

—— اور کیا پہلے زمانے میں کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ اچانک کوئی بھکارن ملکہ بن گئی ہو اور کسی دیو نے ترس کھا کر کسی بھکارن کو سات ملکوں کی بادشاہت سونپ دی ہو۔ میری اندھی ماں کو تو ایسی بے شمار کہانیاں یاد تھیں۔

جب ہم لوگ دن بھر اس کے ساتھ گلی گلی گھوم کر بھوک اور تھکن سے رونے لگتے تو وہ کہانیاں شروع کر دیتی۔ ایک کے بعد دوسری کہانی جیسے انا تھ آشرم کے دروازے سے فقیروں کی ٹولیاں نکلنا شروع ہوں تو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیں یا کسی بڑی سڑک پر موٹروں کی قطار جنھیں گنتے گنتے آدمی تھک جائے اس کی کہانیوں میں دودھ اور شہد کی نہریں ہوتیں حلوے جلیبی کے ڈھیر ہوتے، روٹیوں کے پہاڑ ہوتے، اور ایسے درخت جن میں صرف پھل ہی پھل ہوتے ہیں۔ کاش کبھی ہم وہاں پہنچ سکتے۔ پھر رات بھر ہم ان ہی شہروں میں گھومتے رہتے اور اتنا کھاتے کہ صبح اٹھ کر

پیٹ بھرا ہوا معلوم ہوتا۔

ایک بار میں نے مجو سے یہ کہانی کہی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ سچ مچ دھرتی پر ایک ملک ہے جہاں دنیا کی ہر نعمت ہر انسان کے لئے ہے۔

مجو بیچارا اس دن کا انتظار کرتے کرتے مر گیا۔

اسی چوراہے پر اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی پڑی تھی۔ اس کی ہر وقت سپنے دیکھنے والی آنکھیں جیسے کسی نئی چیز کو دیکھنے کے انتظار میں کھلی ہوئی تھیں اور زندگی بھر جھوٹ بولنے کے باوجود چہرہ پر ایسا نور تھا جو صبح کے اجالے میں گھلا ہوا ہوتا ہے۔ سب بھکاریوں کے ساتھ میں بھی دیکھنے کو گئی تھی

میں نے کہا۔

مجو بابا۔ تو اچھے دنوں کا انتظار کرتے کرتے مر گیا مگر ہم تیری یاد کا دیا نہ بجھنے دیں گے۔ کیونکہ ہم نے اسی امید کے سہارے اپنی زندگی کی باقی سانسوں کو وابستہ کر رکھا ہے۔ کیونکہ ہمارا راستہ غم اور آنسوؤں کی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا ایک ایسے باغ کی جانب جاتا ہے جہاں پھول ہی پھول ہوں زندگی کی چند دل آویز خواہشیں ہمیں مستقبل کے دھندلکوں سے اشارہ کرتی ہیں اور ہم کبھی آہستہ اور کبھی تیز ان کی جانب دوڑتے رہتے ہیں۔ جتنا ہم انھیں پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں وہ پیچھے ہٹتی جاتی ہیں۔

یہاں تک کہ آج میں ان کا پیچھا کرتے کرتے اسی خزاں رسیدہ درخت کے نیچے گر گئی ہوں۔

تم بھی ہمت مت ہارو۔ بابو۔ اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑتے جاؤ اپنی ناکام امیدوں کو سینے سے لگائے جیتے جاؤ خواہ ہر امید ناامیدی کے اندھیرے میں ڈوب جائے مگر دھرتی کے سینے کو اپنے بھاری قدموں سے کچلے جاؤ تاکہ یہ پرانے نقش جو زمین کے سینے پر پیوست ہو چکے ہیں مٹ جائیں اور نئی شاہراہوں کی بنیاد ڈالی جا سکے جہاں عورت کو بھکارن، بیگم اور طوائف میں تقسیم نہ کیا جا سکے جہاں تم دمڑوں کے پیچھے دوڑنا چھوڑ دو۔

دوڑتے جاؤ بابو جی۔ اپنی مرتی ہوئی امیدوں کا پیچھا مت چھوڑو۔ لیکن دیکھ لینا وہ مجو کی درخشاں صبح ایک نہ ایک دن ضرور آئے گی۔ مجو کو اس کا یقین تھا۔ مجھے بھی اب یقین ہو گیا ہے۔

مگر میری منزل تو قریب اب آ گئی ہے۔ یہی املتاس کا پیڑ جس کے نیچے کبھی میں نے جنم لیا ہوگا۔ یہاں سے کل پولیس کا سپاہی میری لاش کو گالیاں دیتا ہوا گھسیٹ کر لے جائے گا اور پھر اس درخت کے نیچے کوئی نئی تندرست چمکتی ہوئی بھکارن کھڑی ہوگی جو آپ کا راستہ نہیں گھیرے گی بلکہ آپ اس کا راستہ گھیریں گے۔ ہر سمت سے زندگی کے دروازے اس پر بند کر دئے جائیں گے۔ چاروں طرف سے گھیر کر لے لوٹا جائے گا تاکہ وہ ہمیشہ بھکارن بنی رہے۔ سڑک پر گزرنے والا ہر شخص اسے پی ڈالنا چاہے گا اور قوس قزح کی کمانوں میں اسے سیر کرانے لیجائیں گے۔ معزز سوسائٹی کے ارکان چہرے پر عزت و شرافت کی جھوٹی نقابیں ڈالے اس کے سامنے جھک جائیں گے۔ بخشش کے طلبگار ہوں گے۔

یہ رنگین لمحے ہر بھکارن کی زندگی میں آتے ہیں کون کہتا ہے کہ بھکارن کی زندگی میں اجالا نہیں آتا! میں نے بھی اپنی زندگی کے سنہرے دن گزارے ہیں

جن کی یاد آج بھی ان تاریک دنوں میں بھی بجلی کی مانند چمک جاتی ہے۔

ہاں بابو صاحب! تم بھی ایک نظر اس دم توڑتی بھکارن پر ڈالتے جاؤ۔

بس صرف آج۔ کل میں اپنا ناسوروں سے بھرا جسم اور مکھیوں سے بھرا چہرہ نہیں دکھا سکوں گی۔ کل باوجود نگاہیں بچانے کے تمہاری نظر اس درخت کے نیچے جائے گی تو میرا پیپ اور خون سے رستا ہوا جسم نہ دیکھ سکو گے۔ کل تم یہ کانپتی آواز نہ سن سکو گے۔

اب یہ بیماریاں مردہ جسم سے چمٹ کر سڑک پر چلنے والے ہر متنفس کو چمٹ جائیں گی۔ یہ لرزتی ہوئی آواز صور اسرافیل کی طرح دھرتی کے کونے کونے پر یوں پھیل جائے گی جیسے سپیرے کی بین پر سانپ جھومنے لگتے ہیں۔ یوں ہی تمام دنیا کے مجبور، لاچار آدمی زہریلے پھن اٹھا کر کھڑے ہو جائیں گے اور عالیشان قصروں میں چین کی نیند سونے والوں کو قیامت کا یقین ہو جائے گا۔

مگر وہ کل شاید ابھی کچھ دور ہو۔

اس لئے آج صرف تم ایک سکنڈ کو مجھے جی بھر کے دیکھ لو میں چاہتی ہوں تمہاری نظروں میں بس جاؤں تمہارے دماغ کی رگوں میں پیوست ہو جاؤں۔ تمہارے اندر چھپ کر ایسے قہقہے لگاؤں کہ تم سب بے تاب ہو جاؤ۔

آج میں اپنی امیدوں و آرزوں کو بھی تمہارے حوالے کر دینا چاہتی ہوں۔ زندگی کی وہ خوش آئند توقعات جو ہر لڑکی اپنے مستقبل کے لئے سجاتی ہے جن سے ہر عورت کے دل کی کوٹھڑی بننے کی دوکان کی طرح بھری رہتی ہے۔ جنھیں پکڑنے کی آس میں زندگی کے اس آخری موڑ تک گھسیٹی گئی ہوں۔ اب اس کانپتی شمع کو میں تمہیں سونپ رہی ہوں۔ یہ چوراہا ہے۔ جہاں سے کل میری لاش اٹھائی جائے گی۔

کیونکہ اب مجھ میں تمہارے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی۔ میرا جسم اب بیکار ہو چکا ہے۔ اب تم ایک نئی خوبصورت بھکارن کو دیکھنا چاہتے ہو۔ جو کل جب تم رنگ و بو کے سیلاب میں کھوئے ہوئے۔ پیاسی نظروں سے کالج گزرنے والی لڑکیوں، موٹروں میں جانے والی عورتوں کو گھور رہے ہوں گے تو اس درخت کے نیچے کھڑی وہ تمہیں مخاطب کرے گی۔

اوہ بابو صاحب ایک نظر ادھر بھی۔

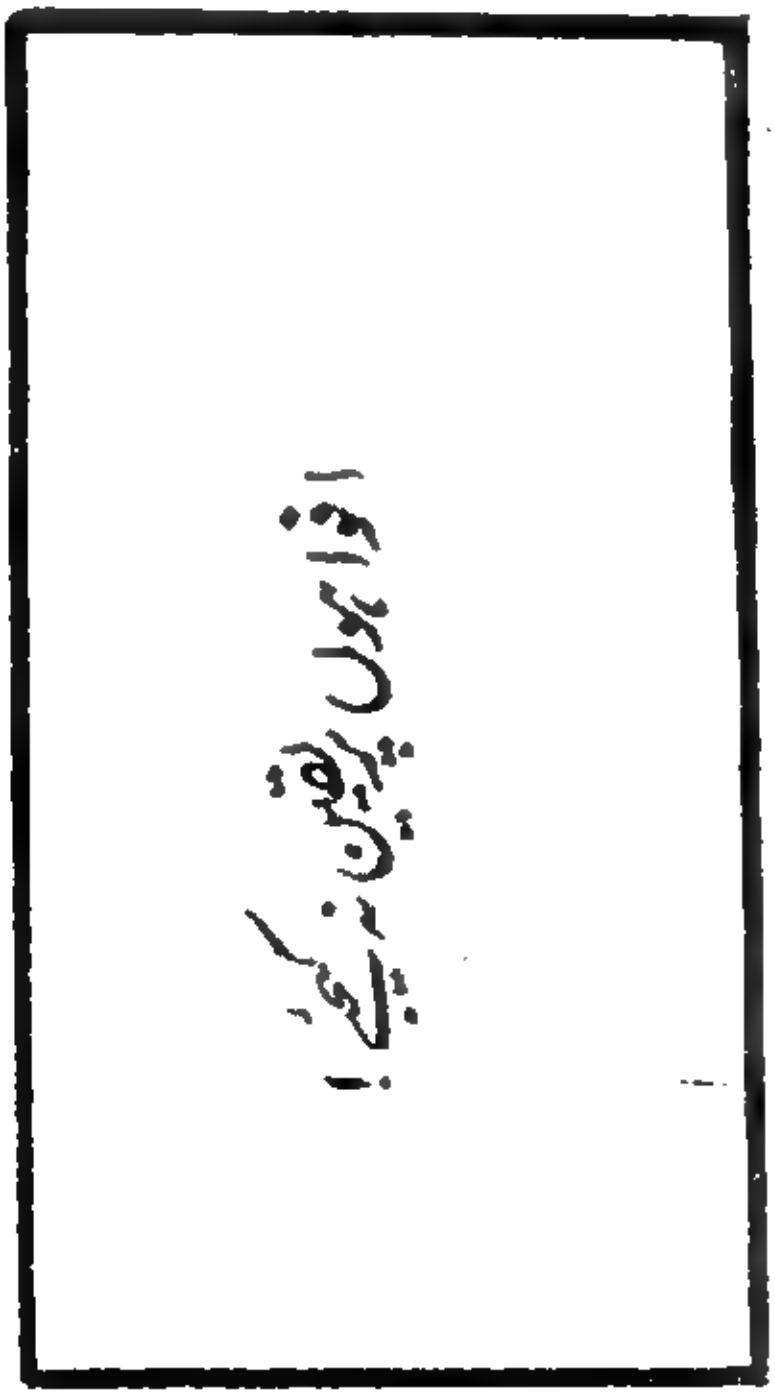

جب تک کہ محبت کا چلن عام رہے گا
ہر لب پہ مرا ذکر، مرا نام رہے گا

عارض سے ترے صبح کی تہمت نہ ہٹے گی
زلفوں پہ تری شام کا الزام رہے گا

معصومیٔ دل تیری قسم ہے کہ جو ہم سے
گر جرم بھی ہوگا تو خوش انجام رہے گا

ہم دن کو حوادث میں گرفتار رہیں گے
راتوں میں یہی آپ سے کچھ کام رہے گا

سنتا ہوں کہ سب حشر میں بے چین رہیں گے
پر تیرے شہیدوں کو تو آرام رہے گا

یہ تیرا شکیبؔ عشق میں باوصفِ فقیری
تہمت زدۂ شوخیٔ ایّام رہے گا

ضیاء الدین احمد شکیب

حیات وارثی

فریاد کہ جلتے ہوئے آنسو بھی پیے ہیں
ہم سینے میں اک آتشِ خاموش لیے ہیں

تاریکیٔ آلام بڑھے فکر نہیں ہے
ہر سمت فروزاں غمِ جاناں کے دیے ہیں

تھی وقت کے ہونٹوں پہ ہنسی دیکھ کے قاتل
دیوانوں نے جب وقت گریباں سیے ہیں

ہنس ہنس کے زمانے کے ستم ہم نے اٹھا کر
ارباب وفا کو نئے پیغام دیے ہیں

روداد الم کہنے کو کہہ سکتا ہوں لیکن
پاسِ غمِ الفت نے مرے ہونٹ سیے ہیں

رفتارِ زمانہ کو ذرا دیکھ رہا ہوں
خود میں نے حیاتؔ اپنے قدم روک لیے ہیں

ہر قسم کی لذیذ اور اصلی گھی سے تیار کردہ مٹھائیوں
کے لیے یاد رکھئے

محمود کنفکشنرز

(آرڈر دینے پر اہتمام سے تیار کی جاتی ہیں)

پتہ : نامپلی مارکٹ روڈ ــــــ حیدرآباد ۱۰

علّامہ نیاز فتح پوری
کا

نگار

- جو اردو صحافت کی تاریخ میں ایک مکمل باب کی حیثیت رکھتا ہے۔
- جو چالیس سال کے طویل عرصہ تک ہماری ادبی فنکاروں کی ذہنی ساخت و پرداخت کرتا رہا۔
- جو اردو داں طبقہ کے مذاق کو نکھارنے میں کامیاب رہا ہے
- جو زندگی اور ادب کی ترقی پذیر روایات اور روشن قدروں کا نمائندہ ہے
- جس نے فکر و فن کی تمام گزرگاہوں کو روشن کیا ہے۔
- اور جس کا بے باک لہجہ اردو میں ضرب المثل بن چکا ہے۔

ظاہر و باطن کی خوشگوار تبدیلیوں کے ساتھ

اکبر علی خاں

کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے

قیمت

سالانہ	فی پرچہ
دس روپے	۷۵ نئے پیسے

نمونہ کیلئے ۷۵ نئے پیسے کے ٹکٹ بھیجیے

مراسلت کے پتے:
ہندوستان میں: ماہنامہ نگار، گھیر سنجی، رام پور۔ یو۔ پی
پاکستان میں: نمائندہ نگار ۹۱۷ این سمن آباد لاہور

عالمی حکومت

تحریر: برٹرانڈرسل

ترجمہ: رشید الدین

عالمی حکومت کا نظریہ گو اس وقت ایک افلاطونی تصور سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا مگر محفوظ دنیا کا مستقبل یقیناً اسی سے وابستہ ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقوام متحدہ عالمی حکومت کی قسم کا ہی ایک ادارہ ہے لیکن جو بھی شخص اپنے ذہن میں عالمی حکومت کا واضح تصور رکھتا ہے وہ اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ اقوام متحدہ اس قسم کا ادارہ ہرگز نہیں۔ ایک حکومت کا سب سے اہم عنصر اقتدار اعلیٰ ہوتا ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ اپنے فرائض انجام دے سکتی ہے لیکن اقوام متحدہ ظاہر ہے کہ اقتدار اور طاقت دونوں سے محروم ہے۔ اس کے دستور میں بڑی طاقتوں کو تنسیخ کا موقع دے کر اس ادارے کو ایک عالمی حکومت قسم کا ادارہ بننے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ اقوام متحدہ روس پر فن لینڈ کے حملے کو تو روک سکتا ہے مگر فن لینڈ پر روس کے حملہ کو نہیں روک سکتا۔ کوریا میں اقوام متحدہ کی فوجیں اس لئے کامیاب ہو سکیں کہ وہاں روس نے اپنے آپ کو خاموش اور بے اعتنا رکھا۔ عالمی حکومت کے قیام کے لئے اقوام متحدہ قسم کے ادارے میں کچھ ترمیمات کی ضرورت ہے۔

آپ کہیں گے ہمیں اس کی کیا ضرورت پڑی کہ ایسے کشیدہ بین الاقوامی ماحول میں جہاں اقوام متحدہ کا پنپنا بھی محال ہے اس سے بھی زیادہ ترمیم شدہ ادارہ کے قیام کی کوشش کی جائے۔ جب دنیا کے حالات سدھر جائیں گے اس وقت خود ہی اس قسم کا ادارہ قائم ہو جائیگا تو آپ کی اس برہمی کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تک جنگ نہ ہونے کی کیا گیارنٹی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ بگڑے ہوئے بین الاقوامی حالات کی وجہ سے مستقبل قریب میں جنگ چھڑ ہی جائے گی بلکہ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس طرح سے جنگ کا خطرہ ہمیشہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہے گا۔ بین الاقوامی اختلافات باہمی بات چیت کے ذریعہ ایک حد تک حل ہو سکتے ہیں لیکن اگر اس ماحول کو بدل کر جلد عالمی حکومت نہ قائم کیجائے تو کوئی نہ کوئی حکومت پھر عالمی جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ لیجئے۔ فرض کیجئے ایک انسانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی بس میں آپ ایک ایسا ڈبہ لیے رہے ہیں جس میں فوراً جل اٹھنے والی خطرناک قسم کی گیس بھری ہوئی ہے۔ احتیاط کے طور پر آپ یہ نوٹس چسپاں کر دیتے ہیں کہ براہ کرم کوئی صاحب سگریٹ نہ پئیں کیونکہ اس سے ساری بس اور اس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی جانوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے لیکن اتنے سارے مسافروں میں ایک آدھ لاپرواہ یا خودسر سگریٹ پی ہی لیتا ہے اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ بالکل یہی حال آج کی دنیا کا ہے۔ جب بہت سے ملکوں کے پاس ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم موجود ہوں اور پھر انھیں کامل اقتدار اور آزادی بھی حاصل ہو تو یہ آپ کے کاغذی بین الاقوامی قوانین کیا کر سکتے

ہیں۔

تیسری عالمگیر جنگ ساری دنیا کو تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں دے سکتی۔ ان ایٹمی جنگ کے بعد کوئی فریق فاتح کہلانے کے لئے سطح ہستی پر موجود نہ رہے گا۔ ہر ملک اور ہر حکومت اس حقیقت سے واقف ہے لیکن اس کے باوجود ہم صرف یہ سوچ کر ہی خاموش نہیں بیٹھ سکتے کہ اس سے ساری حکومتیں آگاہ ہیں صرف اس ایک خیال سے جنگ کا خطرہ نہیں ٹل سکتا۔ انسان فطرتاً خودغرض ہے جیسا کہ مسٹر ایٹلی سابق وزیراعظم انگلستان نے اپنی ایک تقریر میں بتایا کہ ہٹلر اپنے آخری ایام میں پسپا ہوتے ہوتے دنیا کو بھی ختم کر دینا چاہتا تھا۔ یا کم سے کم سخت نقصان پہونچانا چاہتا تھا اور اگر اس کے سائنس داں ایٹم بم بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو یقیناً وہ اپنے اس شیطانی ارادے پر کاربند ہو جاتا اور دنیا کو تباہ کر دیتا۔ لیکن ہٹلر پاگل تھا اور مجھے امید ہے کہ کمیونسٹ لیڈر پاگل نہیں ہیں لیکن مستقبل میں اس طرح اقتدار کے نشے میں پاگل لیڈر پیدا ہو سکتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جب تک بڑے پیمانے پر ہونے والی جنگوں کا کوئی حل نہ سوچا جائے اور میرے خیال میں اس کا بہترین حل ایک عالمی حکومت کا قیام ہے۔

عالمی حکومت میں اقوام اور ممالک کے قبضہ میں اتنی کم طاقت ہونی چاہیئے کہ پھر کسی بڑی اور تباہ کن جنگ کا خطرہ باقی نہ رہے۔ عالمی حکومت کی مرکزی کمیٹی کے پاس تمام ہتھیاروں کا اجارہ ہونا چاہیئے اور صرف اتنے ہتھیار اقوام اور ممالک کے قبضہ میں دینا چاہیئے جن سے وہ اندرون ملک کا انتظام کر سکیں

اگر عالمی حکومت مختلف ریاستوں کے درمیان معاہدے روکنے میں کامیاب ہو گئی تو پھر خود بخود بہت ساری ریاستوں کا ایک گروہ بن جائے گا جس طرح کہ امریکی مغربی یورپ، روس، چین اور ہندوستانی وفاقی سلطنتوں میں ہوا۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر ہمیشہ خانہ جنگی کا خطرہ باقی رہے گا۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ہتھیاروں کی اجارہ داری کے بعد کیسے اور کونسے معاملات ہیں جن کی وجہ سے عالمی حکومت مستحکم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نکتہ یہ ہے کہ مختلف ریاستوں کے درمیان معاہدات نہ ہونے پائیں۔ عالمی وفاقی حکومت کی مختلف ریاستوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی معاہدہ یا صلح نامہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی اجازت مرکزی عالمی حکومت سے نہ لی گئی ہو۔ اگر دو ریاستوں کے درمیان کسی قسم کی چپقلش یا نزاع ہو تو اس سلسلے میں مرکزی عالمی حکومت کا فیصلہ اٹل اور قطعی ہوگا۔

ایک اور پیچیدہ سوال آبادی کے متعلق ابھرتا ہے۔ آج بھی چند جاپانی جزائر کے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں آسٹریلیا میں بسنے کی اجازت دیں۔ لیکن کوئی آسٹریلوی اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کے کچھ حصے بہت زیادہ زرخیز اور آباد ہیں تو کچھ حصے بہت کم آباد ہیں۔ عالمی حکومت قائم ہونے کے بعد زیادہ آباد علاقوں کا یہ مطالبہ ہوگا کہ انھیں کم آباد علاقوں میں بسنے کی اجازت دی جائے لیکن

میں نہیں سمجھتا کہ عالمی حکومت ریاستوں کے اس قومی اور خالص اندرونی معاملے میں دخل دے گی۔ اگر اس نے ایسا کیا تو مجھے ایسا اندیشہ ہے کہ وہ اپنے اس اولین فرض کو کہ جنگ نہ ہونے پائے کو اچھی طرح انجام نہ دے سکے گی۔

عالمی حکومت کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ خام اشیاء کی فراہمی کا ہے۔ میرے خیال میں عالمی حکومت کو اپنی تمام ریاستوں میں برابر برابر خام اشیاء سربراہ کرنی چاہئے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ خانگی سرمایہ کے سلسلے میں کوئی غیر معقول دخل اندازی ہوگی جبکہ خانگی نظم و نسق ریاستوں کے ہاتھوں میں ہوگا۔ ایٹم اور جوہر کے ذریعہ جتنی بھی چیزیں یا ہتھیار بنیں گے چاہے اسے کوئی ایک قوم بنائے یا مختلف اقوام مل کر بنائیں اس کی اجارہ داری بہر حال مرکزی عالمی حکومت کو حاصل رہے گی۔ میرے خیال میں کس حد تک انسانی نفسیات کو موڑنے میں ایک عرصہ لگے گا۔ اس کے بعد خود بخود انسانی نفسیات اس ماحول سے مانوس ہو جائے گی۔ اور اکثریت کے دلوں میں کسی قسم کی جنگ کا خیال نہیں رہے گا۔ بجز گنتی کے چند لوگوں کے جو اٹھتے بیٹھتے جنگ کا خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ اس طرح انسانی نسل کے تباہ ہونے کا بہت کم اندیشہ باقی رہے گا۔

میں یہ پیشین گوئی نہیں کرتا کہ جس طرح کی عالمی حکومت کا خاکہ پیش کیا ہے وہ قائم ہو کر بھی رہے گی۔ بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہر ملک

طریقہ سے انسانی نسل کو تباہ ہونے سے بچانا چاہئے اور اس کا یہ بھی طریقہ ہو سکتا ہے اور ہے۔ اس سے انکار تو نہیں کہ مقامی آزادی چھن جانے سے ایک قسم کی تکلیف ہوگی لیکن یہ ایک عارضی بات ہوگی اور لوگ رفتہ رفتہ اس کے عادی ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے بھی ہمیں تاریخ میں تقریباً اس قسم کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً عہد وسطیٰ میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ جس میں ہر جاگیر کی ایک الگ حیثیت تھی اور ہر جاگیردار کو غیر معمولی آزادی حاصل تھی پھر یہ چھوٹی چھوٹی جاگیروں کا نظام ختم ہو کر شہنشاہی نظام رائج ہوا۔ پھر اس کی جگہ جمہوری نظام نے لے لی اور پھر آج کئی کئی جمہوریتوں کے وفاق اور بلاک بن گئے ہیں۔ اس طرح کا ایک اور اہم مرحلہ ہمارے سامنے آگیا ہے اور وہ ہے عالمی حکومت کا قیام۔

آج کل انفرادی آزادی کا جذبہ بہت عام ہے لیکن جو لوگ یہ جذبہ رکھتے ہیں اور اسے مقدم جانتے ہیں کہ انھیں عالمی حکومت کے قیام سے خوف نہیں کھانا چاہئے۔ عالمی حکومت بھی ہر شخص کو اس کا برابر حق دے گی۔ اور جنگ اور ہنگامۂ جنگ کا ماحول ختم ہو جانے پر ایک منفرد شخص اپنے کاروبار اور بھی زیادہ اطمینان اور مستعدی سے چلا سکے گا۔ عالمی حکومت صرف اجتماعی آزادی کی قربانی چاہتی ہے۔ انفرادی آزادی کی نہیں۔ عالمی حکومت میں ایک انفرادی شخص کی خدمات چاہے وہ ادب کے میدان میں ہو یا سائنس کے اور زیادہ سراہی جائیں گی۔ کیونکہ دنیا جنگ کے خطرے سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکی ہوگی۔

غیر تربیت یافتہ بچوں کی آزادی انھیں خود سر کر سکتی ہے مگر یہی آزادی بڑے لوگوں کے لئے مناسب نہیں۔ اب جبکہ انسانی معاشرہ اپنے بچپن کے دور سے گزر چکا ہے۔ اسے بچکانہ حرکتیں چھوڑ دینی چاہئے اور یہ بچکانہ حرکتیں اسی وقت دور ہوں گی جبکہ ایک عالمی حکومت کی تشکیل عمل میں آجائے اور تمام دفاعی اختیارات اس کے سپرد کر دئیے جائیں تاکہ جنگ کا کوئی خطرہ ہی نہیں رہے گا ——

بقیہ "تھوریو"

لیکن عام شہرت اور عوامی مرتبہ نہ ملنے کے باوجود ایک خاص حلقہ آج بھی امریکہ اور امریکہ سے باہر ایسا ہے جو تھوریو کے نام و مقام سے واقف ہے اور میرے خیال میں یہی اس کے لئے کافی ہے۔ سو بے شعور لوگوں سے دس باشعور لوگوں کا ہی کسی کو جاننا بہتر ہے۔

تھوریو ان لوگوں میں سے ہے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے کام اور نام کو جاننے اور سمجھنے میں بھی صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ تھوریو دراصل اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا جائے گا اس کے نام اور کام کو لوگ سمجھتے جائیں گے۔ بہرحال اہنسا' آزادی' مساوات اور انفرادیت کے نام لیواؤں اور اس کاز کو آگے بڑھانے والوں میں تھوریو کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا ——

پیکر اور برصغیر ہند و پاک کے تمام ادبی رسالوں
کتابوں قرآن مجید سپارے قاعدے وغیرہ کے لئے
پتہ: آزاد کتاب گھر
ساکچی بازار
جمشید پور

اگر قسمت سے اک بت کا جو سنگِ آستاں ملتا
نئی اک زندگی ملتی سکونِ جاوداں ملتا
جو ہوتی چشمِ بینا دیکھتے کیا کیا نہیں ملتا
جگر میں درد ملتا قلب میں سوزِ نہاں ملتا
تمنا تھی تو بس اتنی تھی اپنی اے جہاں والو!
"مجھے جنت نہ ملتی کاش ان کا آستاں ملتا"
وفا کا نام مٹ جاتا تماشا ایک بن جاتا
کبھی جو عشق کے دامن پہ خونِ عاشقاں ملتا
گھٹا چھائی ہے ساقی میں نے آواز دی تجھکو
اگر ایسے میں ہلکے ایک جامِ ارغواں ملتا

ظہیر بنگلوری

ساجن بھارتی

پھر تصور بہار کی باتیں کریں
پھر جمالِ یار کی باتیں کریں
پھر سجائیں بزمِ خونِ آرزو
پھر گل رخسار کی باتیں کریں
پھر محبت سے تلوّن آشنا
پھر مزاجِ یار کی باتیں کریں
پھر گذر جائیں حدِ احساس سے
پھر غم و تکار کی باتیں کریں
پھر بہ خونِ دل منائیں جشنِ نو
پھر رسن اور دار کی باتیں کریں

جبلّتوں کی ملکہ

جمالیاتی جبلّت

مجیب الرحمان

تعلیم کے تصور کے ساتھ ہی ذہن میں موٹی موٹی کتابیں آ جاتی ہیں جن میں آرٹ اور سائنس ادب اور فلسفہ کو دو واضح خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ ایک خانہ میں ایسا ادب ہے جس میں انسان کی زندگیوں کی بناوٹ میں حصہ لینے والی بنیادی خواہشات، جذبات اور ایسے ہی تجربات کو وفاداری کے ساتھ ظاہر کرنے والی اقدار ہیں جو انسان کو متحرک کرتی ہیں اور دوسرے خانے میں سائنس اور فلسفہ وغیرہ کی کتابیں ہیں جن کے ذمہ کائنات کے مظاہر کی ماہیت اور حقیقت کو تبلانا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی پڑھائی جاتی ہے کہ ادب اور آرٹ کا کام یہ ہے کہ ہمارے جمالیاتی ذوق کو تسکین پہونچائے جس کی وجہ سے ہی وہ لازوال ہے جبکہ سائنس اور فلسفہ میں ہر نئی تحقیق کے ساتھ پرانی کتابیں پرانی ہو جاتی ہیں اور نئی کتابوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے وغیرہ۔

"Croce" نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آرٹ وجدان کا دوسرا نام ہے۔ جو ہمارے ہیجان کو زبان عطا کرنے سے وجود میں آتا ہے۔ مگر ہمارے علم کی دنیا کا ایک اہم انقلابی سوال ابھی ادھورا ہی ہے کہ آیا

سائنس اور فلسفہ جیسی تخلیقات میں جمالیاتی ذوق اور وجدان کا دخل نہیں ہے! اور کیا ایسا ممکن ہے کہ جمالیات کے اعلیٰ ذوق کے بغیر کائنات کی حقیقت کا اعلیٰ علم حاصل ہو؟ علم کا یہ ادھورا پن غالباً اس لئے ہے کہ ہم انسان کے عمل اور رد عمل کی بنیاد کے بارے میں کوئی واضح نقطۂ نظر نہیں رکھتے یا مختلف نقاطِ نظر کو جوڑنے کی بجائے ان کے وجود سے جھٹلا کر نیم منفی نیم مثبت نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

انسانی سماج کی قوت تحریک (Motivation) کو سمجھانے کے لئے ہمارے سامنے مختلف نقاطِ نظر ہیں۔ 'میک ڈاگل' اور اس کے ہم خیال لوگوں کا جبلتوں کا نقطۂ نظر' فرائڈ کا نفسیاتی تجزیاتی طریقہ' مارکس کا جدلی اور تاریخی مادیت کا طریقہ' اور ڈبلیو۔ آئی۔ تھامس' کا انسانی خواہشوں کا نقطہ نظر۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سارے اور ایسے دوسرے خیالات میں جو بنیادی باتیں ہیں۔ ایک مشترک اصول ہی کو بتاتی ہیں۔ اور وہ ہے زندگی کی بقا کے لئے کشمکش کا اصول۔ اس طرح ان سارے اصولوں کو جوڑنے کے باوجود بھی ایک اور سوال باقی رہ جاتا ہے کہ کیا انفرادی انسان کے عمل اور ردعمل' گھٹن' اور نفسیاتی اظہار میں جمالیاتی ذوق کی عدم تسکین بھی سبب کا مقام رکھتی ہے۔

میرے خیال میں جمالیاتی ذوق بھی ایک اہم جبلت ہے۔ کیونکہ یہ بھی ایک بنیادی مزاج کا کام کرتی ہے جو انسان کے نامیاتی نظام میں ایک قسم کی جذباتی تحریک پیدا کر کے اسے ایک مخصوص ماحول میں ایک مخصوص عمل کے لئے اکساتی ہے۔

میک ڈاگل' نے جو چودہ (۱۴) جبلتیں بتائی ہیں جنہیں تین خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ خودی کی جبلتوں میں (۱) فرار (۲) نفرت (۳) عاجزی (۴) اظہار خودی (۵) تجسس (۶) حصول (۷) غذا کی چاہت (۸) تعمیر اور (۹) ہنسی ہے۔ پھر جنس کے خانے میں اس نے دو جبلتیں بتائی ہیں (۱) جنسی تعلق (۲) پدرانہ اور مادرانہ شفقت۔ اسی طرح گروہ کے خانے میں (۱) اپیل اور (۲) میل ملاپ کی جبلت بتائی ہے۔ ظاہر ہے چونکہ یہ ساری جبلتیں سب جانداروں میں یکساں طور پر نہیں پائی جاتیں اور یہ چونکہ انسان کے بارے میں ہیں اس لئے ان میں ایک ایسی جبلت کی کمی محسوس ہوتی ہے جو عملی زندگی میں اقدار کو مثبت اور منفی روپ دینے والی حیثیت رکھتی ہے۔ انصاف، بہادری، حب الوطنی، انسانی رنگ و روپ اور دوسرے پسندیدہ مظاہر کے بارے میں مثبت ردعمل اور ناانصافی، ڈرپوک پن، غداری، بدصورتی اور دوسرے ناپسندیدہ مظاہر میں منفی ردِعمل کے اظہار کے پیچھے حیوانی جبلتوں کے علاوہ ایک ترقی یافتہ وجدانی تحریک بھی کام کرتی ہے جسے جمالیاتی جبلت بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف دوسرے جانداروں میں مثلاً مادہ ڈھکوری جنسی تعلق سے پہلے جبلی طور پر ایسا گھروندہ بناتی ہے جس میں اس کے پیدا ہونے والے انڈے اور اس سے پیدا ہونے والے بچے کی غذا کے لئے مارے ہوئے کیڑے کے لئے کافی جگہ ہو۔ اس جاندار کے شروع سے آخر تک کے پورے عمل میں تعقل کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کے برخلاف انسان ہر ایسے عمل میں واجبیت اور غیر واجبیت

اچھائی اور برائی کے پہلو پر سوچتا ہے۔ یہ خصوصیت انسان کی ساری جبلتوں کے ردعمل کو پرکھنے میں مدد دیتی ہے۔

سائنس دانوں نے تجربہ کیا ہے کہ جب کتے کی ذریا عضو کی جبلت متاثر ہوتی ہے تو اس وقت اس کے منہ سے رال کا بہنا بند ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی مخصوص جبلت ایک مخصوص ماحول سے ٹکراتی ہے تو اس جاندار کا سارا نامیاتی نظام متاثر ہو جاتا ہے۔ گویا نامیاتی نظام میں جسمانی ہیئت کا تعلق اس کی خصوصیات سے بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس مثال میں کتے کی رال کے بند ہو جانے سے ظاہر ہونے والی ہیئت کی تبدیلی کتے کے اس وقت کی نامیاتی کیفیت اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔

اسی طرح ہم انسان کو دیکھتے ہیں کہ جب وہ کسی پسندیدہ شئے کو دیکھتا ہے تو وہ بے انتہا خوش ہوتا ہے۔ اور کسی مکروہ شئے کو دیکھتا ہے تو اس کی جذباتی حالت مختلف ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے جمالیاتی جذباتی اور نفسیاتی ردعمل کے پیچھے کوئی جبلی طاقت کام کرتی ہے جس کا کوئی حیاتی مقصد ضرور ہوگا۔ اس طرح ہم جمالیات کے جبلی مقصد کے اصول کے سوال سے روشناس ہوتے ہیں۔

جمالیات کے جبلی مقصد پر بحث کرنے سے پہلے ہم جمالیاتی عدم آسودگی کا بھی مختصر جائزہ لیں تو بہتر ہوگا۔

'سگمنڈ فرائڈ' نے انسان کے نفسیاتی تجزیہ کے سلسلے میں بتایا ہے کہ اس کی ساری جبلتیں دو گروہ میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک گروہ نوع انسانی کی پیدائش کے لئے کام کرتا ہے تو دوسرا گروہ اس کی بقا کے لئے مختص ہے۔ اور جب دو جبلتوں کے ان دو گروہوں میں یعنی جنس اور خودی میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور جب انسان اس ٹکراؤ کی تکالیف کو ناگوار سمجھ کر بھلا دیتا ہے تو اس سے مختلف نفسیاتی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ شعور کے محاسبہ سے بچنے کے لئے ٹکراؤ کا یہ اظہار مختلف بہروپ انداز میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔

مگر 'ولیم میک ڈوگل' نے فرائڈ کے خیال میں ترمیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ خودی اور جنس کی جبلتوں کے علاوہ پدرانہ اور مادرانہ شفقت کی جبلتوں سے بھی ٹکراؤ ممکن ہے۔ گویا ساری نفسیاتی بیماریاں ان تین جبلتوں کی بے آسودگی سے ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہوتی تو نفسیاتی بیماروں کی ایسی مثالیں نہ ملتیں جن میں ان تینوں جبلتوں کی تسکین کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ہم کئی ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو سماج میں اونچا مقام حاصل کر کے خودی کے جذبہ کی تکمیل کرتے ہیں۔ اور بیاہی زندگی گزارتے ہیں۔ یہ جنسی اور پدرانہ و مادرانہ جذبہ کی آسودگی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کے باوجود وہ کسی نہ کسی نفسیاتی گھٹن کے شکار ہوتے ہیں۔ پھر وہ کونسی گھٹن ہو سکتی ہے۔ میرے خیال میں یہ چوتھی گھٹن جو سب سے زیادہ عالمگیر ہے وہ ہے جمالیاتی ذوق کی گھٹن۔ انسان جبلی طور پر نہ صرف اشیا کا مادی طلب گار ہے بلکہ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ ان کا حصول ایک خاص ڈھنگ کا ہو۔ پیٹ بھرنے کے لئے وہ نہ صرف غذا چاہتا ہے بلکہ اس کے پسند کی ایک خاص ڈھنگ کی غذا سے۔ نہ صرف وہ رنگوں کو ہی پسند کرتا ہے بلکہ ایک خاص

رنگ کو اولیت دیتاہے۔ وہ نہ صرف خوشبوؤں کو پسند کرتا ہے بلکہ ایک مخصوص خوشبو کو اپنی روح سے مطابق پاتا ہے۔ نہ صرف وہ زندگی کے لئے فلسفہ چاہتا ہے بلکہ ایک خاص فلسفہ ہی اسے زیادہ پسند ہوتا ہے۔ نہ صرف وہ انسانوں کو پسند کرتا ہے بلکہ ان میں سے چند لوگوں سے ملکر وہ زیادہ خوش ہوتا ہے ۔ اور چند لوگوں کی صورت سے ہی اسے تعصب ہوتا ہے ۔ چھوٹے بچے ان کی بہترین مثال ہیں وہ ان جانے لوگوں میں چند کے پاس بالکل نہیں جاتے اور چند لوگوں کے پاس بے اختیار چلے جاتے ہیں۔ کیا اس بے اختیار دلچسپی کا کوئی اصول نہ ہوگا اور کیا اس کا کوئی مقصد نہ ہوگا۔

حسن کی تعریف کرتے ہوئے ین۔ جی۔ چرنیشفسکی' نے کہا ہے کہ "زندگی ہی حسن ہے"۔ اور اسلئے زندگی کی تعمیر کی امنگ میں حسن کی تخلیق کی امنگ پوشیدہ ہے۔ اور زندگی کا پایا جانا حسن کا پایا جانا ہے۔ اور اس لئے حسن کی تخلیق کے لئے زندگی سے پرے کوئی علیحدہ صنعت گری کی حاجت نہیں ہے مثلاً شہد کی مکھیاں اپنی زندگی میں مگن بغیر کسی سوچے سمجھے منصوبے اور تیاری اور شعور کے جو شہد کا چھتہ بناتی ہیں وہ کتنا حسین اور جیومیٹری کی صحت کا نمونہ ہے یہ سب جانتے ہیں۔

اس سلسلہ میں انسان کے جسمانی پیکر اور اس کی خصوصیت کے بارے میں کی گئی تحقیقات اس کے جمالیاتی راز کو سمجھانے میں مدد دے سکتی ہیں۔ آج سے (۲۳۰۰) برس پہلے کے یونانی حکیم ہپاقریطس' کی تحقیقات پر ڈاکٹر ای کرشمر (Dr - E-Kretchmer) نے انسان کو اس کے جسم اور خصوصیات کے مطابق میں بنیادی طور پر دو حصوں میں بانٹا ہے جیسے :۔

		جسمانی اعتبار سے گول چہرے اور جسم کا انسان	جسمانی اعتبار سے لمبوترے چہرے اور جسم کا انسان
	نام ٹائپ	پکنک (Pyknik)	لیپٹوسیم (Leptosome)
		حقیقت پسند	سوز وگداز کا دلدادہ - تنہائی پسند
۱	شاعر	مزاح نگار	رومانی، ہیئت پرست
۲	تجربہ کی دنیا والے	مشاہدہ کرنے والا، تذکرہ نویس تجربہ کا دلدادہ	سخت قسم کا منطقی، نظم وضبط پسند کرنے والا مابعد الطبیعیات سے دلچسپی رکھنے والا
۳	لیڈر	مسرت آگیں کاموں کی تنظیم سے دلچسپی رکھنے والا (اسپورٹس وغیرہ) صلح کرانے والا	پکا تصوریت پسند، مطلق العنان، جنونی بے رحم، تخمینہ باز

ڈاکٹر کرشنر نے یہ بھی بتایا کہ عام انسان ان دونوں خصوصیات کا مرکب ہوتے ہیں اور اس طرح دونوں کے امتزاج سے جسمانی اعتبار سے انسانوں کے کئی ٹائپ وجود میں آتے ہیں۔

اس طرح جمالیات کے جبلی مقصد کو ڈھونڈنے میں اس خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے میں نے عرض کیا ہے کہ (۱) بنیادی طور پر سارے جسمانی ٹائپ کے انسان اپنے ہم قبیل ٹائپ کے انسانوں سے ہی دلچسپی اور کشش رکھتے ہیں۔ (۲) لیکن اگر کسی مخصوص قبیل کے انسان میں اس کی نسل کو آگے بڑھانے کی ترقی پذیری ختم ہو گئی ہو تو وہ اپنی مخالف سمت کی ٹائپ کی خصوصیات حاصل کرنا چاہے گا اس لئے وہ مخالف سمت کی ٹائپ کے جسم میں کشش محسوس کرے گا کیونکہ اس کی مستقبل کی نسل کے لئے مخالف ٹائپ کی خصوصیات درکار ہیں۔

(۳) چونکہ مختلف ٹائپ کے وجود کی وجہ سے مختلف حسن کے معیار متعین ہوتے ہیں۔ اور ہر ٹائپ اپنی ہی قسم کے لئے کشش رکھتا ہے۔ اس لئے تغیر پذیر ٹائپ میں اپنے خاندان سے روگردانی کرتے وقت اس کی ہیئت میں ایسی ظاہری تبدیلی آجاتی ہے کہ وہ اس کی پسندیدہ ٹائپ کے لئے قابل قبول ہو جاتا ہے یعنی کسی لمبوترے چہرے کے فرد میں اپنے خاندان میں ترقی پذیری نہ نظر آئے تو بنیادی ساخت میں وہ لمبوترا ہونے کے باوجود گوشت پوست کے اضافہ سے خود کو ایسا تبدیل کر لیتا ہے کہ وہ بالکل گول مول معلوم ہوتا ہے اور "پکنک" فرد سے شادی بیاہ کرنے یا نفسیاتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں کشش پیدا کرے گا۔

(۴) جمالیاتی حس افراد کی شخصیت کی تعمیر اور نسل انسانی کی بقا کے لئے ضروری خصوصیات کے حاصل کرنے میں اتصال کے ذریعہ کا کام کرتی ہے۔ حسن چونکہ انسان کو ہیئت میں نظر آتا ہے، ہیئت چونکہ ایک کیفیت کی حامل ہوتی ہے اس لئے حسن ایک مخصوص انسانی شخصیت اور کیفیت کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

(۵) مختلف ٹائپ کی ان کی اپنی خصوصیات کی تصدیق کے لئے ہم آہنگی کے اصول کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر کسی مخصوص ٹائپ اور اس کی مخصوص خصوصیت میں ہم آہنگی نہ ہو تو ایسا ٹائپ اپنے ماضی سے فرار اختیار کر لیتا ہے۔ اور مخالف سمت کی جانب بڑھتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی لمبوترے چہرے کے فرد میں گول چہرے والے ٹائپ کی خصوصیات ملیں تو ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ یہ لیپٹوسیم تغیر پذیر ہے اور پکنک کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسے فرد کو گول چہرے والے لوگ اور گول ساخت کی چیزیں ہی پسند آتی ہیں۔

گویا انسان کی جمالیاتی دلچسپی میں اس کے پسندیدہ ہیئت کے پردہ میں وہ مخصوص کیفیت چاہتا ہے اور جب اسے اس سے مختلف ہیئت کی شئے نصیب ہوتی ہے تو گڑھتا ہے اور اس غم کو نہ سہہ کر نفسیاتی بیمار بنتا ہے۔ اس طرح نفسیاتی بیمار زیادہ تر حسن کا بیمار ہی ہوتا ہے۔

آخر میں آرٹ اور سائنس کے فرق کے بارے میں جمالیاتی تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے (باقی صفحہ پر)

تازہ ترین فلمی خبریں

پرچھائیاں

ہند کی فلمی صنعت کے تعلق سے ۱۹۶۲ء ہر لحاظ سے انتہائی مایوس کن سال ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ پچھلے سال کی اکثر فلمیں مالی اعتبار سے ناکام ثابت ہوئیں۔ ۱۹۶۱ء میں گنگا جمنا یا پھر جنگلی کو جتنی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس سال کسی بھی فلم کو نہیں مل سکی جیسے ہریالی اور راستہ میں چپ رہوں گی اور آرتی کی سلور جوبلیاں ضرور منائی گئیں لیکن سمجھا جاتا ہے کہ وہ سب مصنوعی تھیں سن آف انڈیا، بیس سال بعد اور کچھ حد تک وغیرہ کامیاب فلمیں ثابت ہوئیں، دھرم پتر اور صاحب بی بی غلام کی ناکامی افسوسناک تھی۔

معیار کے اعتبار سے صاحب بی بی غلام مکمل ترین تصویر کہی جا سکتی ہے سن آف انڈیا اور بیس سال بعد بہت سی خوبیوں کی بنا پر یادگار رہیں گی فلموں کے عالمی مقابلے میں پچھلے سال ہندوستان نے کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں کی گنگا جمنا کے لئے دلیپ کمار نے ہند کیلئے واحد عالمی اعزاز حاصل کیا تھا ۱۹۶۳ء سے ہم یقیناً اس سے بہتر توقعات رکھ سکتے ہیں۔

۱۹۶۲ — مایوس کن سال

سال بھر کا مختصر ترین جائزہ

ہدایت کاری: بڑے ہدایت کاروں میں محبوب اور بمل رائے نے "سن آف انڈیا" اور "پریم پتر" سے بری طرح مایوس کیا۔ شانتا رام، بی آر چوپڑا اور راجکپور کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی۔ ہدایت کاری کے لحاظ سے سال کی بہترین فلم "صاحب بی بی غلام" ہے جس کے ہدایت کار ابرار علوی تھے یش چوپڑا نے دھرم پتر میں کافی اچھی ہدایت کاری پیش کی تھی۔

اداکاری: تمام بڑے اداکاروں نے مایوس کیا دلیپ کمار کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی۔ راجکپور اور دیو آنند کی چند فلمیں ریلیز تو ہوئیں مگر دونوں اداکار ناکام رہے۔ صرف گرودت نے "صاحب بی بی غلام" میں بے انتہا متاثر کیا۔ صاحب بی بی غلام میں مینا کماری اور وحیدہ رحمٰن نے بھی بہت عمدہ اداکاری پیش کی تھی۔ سن آف انڈیا میں ساجد بھی یاد رہے گا۔

موسیقی: سن آف انڈیا میں نوشاد اور بات ایک بات کی ہے [illegible] کی موسیقی بہت پسند کی گئی۔ بیس سال بعد اور صاحب بی بی غلام کے ذریعہ ہیمنت کمار ایک مسافر ایک حسینہ کے ذریعہ او۔ پی نیر اور انپڑھ کے ذریعہ مدن موہن نے پھر اپنی مقبولیت حاصل کرلی۔ آرتی میں روشن کی موسیقی بھی اچھی تھی شنکر جے کشن کی کوئی ست فلمیں ریلیز ہوئیں لیکن تمام فلموں کی موسیقی انتہائی معمولی تھی۔

ادبی شعبہ: اس سال کسی فلم کی کہانی کو غیر معمولی نہیں کہا جا سکتا۔ مکالموں کے اعتبار سے صاحب بی بی غلام اہمیت رکھتی ہے۔ اور گیتوں کے لحاظ سے سن آف انڈیا، بیس سال بعد اور صاحب بی بی غلام کامیاب تھے۔ مجروح سلطانپوری [illegible] کی سے پیارے گیت لکھے۔

میرے محبوب کے بعد سادھنا مقبول ترین اداکارہ ہوگی

سادھنا کے کلوز اپس کیلئے لوگ کئی کئی بار فلم دیکھیں گے

شکیل بدایونی نے حیدرآباد میں ایک ذاتی ملاقات میں بتایا کہ ایچ۔ ایس۔ رویل کی رنگین فلم "میرے محبوب" کی ریلیز کے بعد سادھنا ملک کی نمبر ایک اداکارہ بن جائے گی۔ اس میں سادھنا کو اتنے خوبصورت انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ لوگ محض سادھنا کے کلوز اپس دیکھنے کے لئے یہ فلم کئی کئی بار دیکھیں گے۔ ان کے اندازے کے مطابق یہ فلم "چودھویں کا چاند" جیسی کامیاب فلم سے بھی دس گنا زیادہ کامیاب ثابت ہوگی ————

دلیپ کمار چوپڑہ کی دو فلموں میں کام کریگا

پتہ چلا ہے کہ فلمساز ہدایت کار بی۔ آر۔ چوپڑہ نے اپنی اگلی دو فلموں کے لئے تیس لاکھ روپے کے معاوضے میں بات طے کر لی ہے۔ یہ دونوں فلمیں رنگین ہیں۔ ایک فلم کے ہدایت کار خود بی۔ آر۔ چوپڑا ہوں گے اور دوسری فلم کے ہدایت کار یش چوپڑہ ہوں گے۔ ایک دوسری غیر مصدقہ خبر میں بتایا گیا ہے کہ جب چوپڑہ نے دلیپ کمار کے ساتھ سادھنا کو پیش کرنے کا ارادہ کیا تو دلیپ کمار نے منظور نہیں کیا ————

جھلکیاں

■ فلمساز ہدایت کار محبوب نے بتایا کہ اگلی فلم یقینی طور پر "ممتاز محل" ہوگی جس میں دلیپ کمار، وحیدہ رحمن اور سائرہ بانو کام کریں گے۔ محبوب نے اس فلم کو مشترکہ طور پر بنانے کے لئے کسی مشہور امریکی فلمساز سے بات کر لی ہے لیکن ابھی وہ ان کا نام نہیں بتانا چاہتے۔ ۷۰ ملی میٹر میں بننے والی پہلی ہندوستانی فلم کی موسیقی نوشاد کے ذمہ ہے۔

■ ایشین فلم سوسائٹی۔ لندن کے ہندوستانی سکریٹری لوتی نے اپنی انگریزی فلم "آوارہ لندن میں" بنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ راجکپور کی اس فلم کے ہدایت کار اسکیھ منڈن ہوں گے۔ کہانی اور منظرنامہ خواجہ احمد عباس کا ہے۔

■ ہند امریکی اشتراک سے بننے والی انگریزی فلم کے لئے دیو آنند کے ساتھ وحیدہ رحمن کو پیش کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہے۔

● راجکپور نے پچھلے دنوں جس دیش میں گنگا بہتی ہے کے عکاس تارو دت کو ان کی خدمات کے صلے میں امپیسڈر کار تحفتاً دی ہے۔

● عاشق کے فلمساز دجے کشور رودبے ہندوستان کے متعلق مختصر ٹیلی ویژن فلم بنانے کی بات طے کرنے کے لئے امریکہ روانہ ہو گئے۔

● نرگس کے تیرہ بھتیجے اور بھتیجیوں میں زاہدہ سب سے خوبصورت بھتیجی ہے۔ کئی فلمسازوں نے زاہدہ کے والد

لیلیٰ مجنوں میں نمی کے نہانے کا منظر

کے۔ آصف نے بتایا کہ وہ اپنی فلم لیلیٰ مجنوں میں نمی کے نہانے کا بالکل عریاں منظر پیش کریں گے اس منظر میں نمی کو لیلیٰ کے رول میں اپنی شادی سے پہلے اس کی سہیلیاں ایک کے بعد ایک کپڑے اتارتے ہوئے نہلائیں گی یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ نمی اس منظر کے لئے تیار ہے یا نہیں کیونکہ اس صورت میں اسے ہدایتکار اور عکاس کے علاوہ کئی لوگوں کے سامنے مکمل عریاں ہونا پڑے گا۔ کے آصف کا خیال ہے کہ سنسر کو اس منظر پر کوئی اعتراض اسلئے نہیں ہوگا کہ یہ منظر انتہائی فنکارانہ ہونے کے علاوہ کچھ اس انداز سے پیش کیا جائیگا کہ لوگوں میں ہیجان پیدا نہ ہو۔

راجکپور بمبئی میں ایرکنڈیشنڈ آر۔ کے ٹاکیز تعمیر کرے گا۔

سالگرہ کے موقع پر راجکپور کا اعلان

آر۔ کے اسٹوڈیو کے تمام کام کرنے والوں نے اس مرتبہ راجکپور کی سالگرہ کے موقع پر ایک انتہائی خوبصورت پروجیکٹر بطور تحفہ دیا۔ اس موقع پر راجکپور نے کام کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ بہت جلد وہ بمبئی میں ایک ایرکنڈیشنڈ ٹاکیز بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سالگرہ کی ایک خصوصیت یہ رہی کہ راجکپور نے روایت کے خلاف آر۔ کے فلمز کی کسی نئی فلم کا اعلان نہیں کیا۔

مختصر مختصر فلمی خبریں

اختر حسین نے اسے فلم میں لینے کے متعلق بات کی تھی۔ لیکن زاہدہ کی تعلیمی مصروفیات کے باعث انھوں نے انکار کر دیا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ فلمی مستری کی فلم "ساجن کی گلیاں" میں زاہدہ دلیپ آنند اور سادھنا کے ساتھ کام کرے گی۔

■ باخبر حلقے بتلاتے ہیں کہ ساحر لدھیانوی بہت جلد ایک ذاتی فلم بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں جس کی کہانی اور مکالمے جاں نثار اختر لکھیں گے اور گیت ساحر لدھیانوی۔

● انگریزی مغل اعظم چند وجوہات کی بنا پر ابھی تک ریلیز نہیں ہو سکی تھی مگر اب معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۶۳ء کے وسط تک انگریزی مغل اعظم بھی شاندار پیمانہ پر ریلیز کردی جائے گی۔ اگرچہ کہ دلیپ کمار، پرتھوی راج اور مدھوبالا نے انگریزی میں مکالمے ادا کئے تھے مگر ان تمام مکالموں کو کے۔ آصف امریکہ میں ڈب کرنے والے ہیں۔

■ یہ مطالبہ اب عام ہوتا جا رہا ہے کہ ملک میں ہنگامی حالات کے باعث اس سال فلم فیر ایوارڈز کی تقسیم کو ملتوی کر دینا چاہیئے۔

■ مدراس کے فلم سازوں میں محمود کی زبردست مانگ کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسوقت مدراس میں بننے والی ۱۹ فلموں میں سے ۱۸ فلموں میں محمود اداکاری کر رہا ہے۔

چار فلموں کی مسلسل ناکامی کے بعد

بمل رائے نے آخر دلیپ کمار کو راضی کر لیا

مدھومتی کی غیر معمولی کامیابی کے بعد ہی مشہور فلمساز اور ہدایت کار بمل رائے نے اپنی اگلی رنگین فلم کیلئے دلیپ کمار اور وجینتی مالا کا اعلان کر دیا تھا مگر معاہدہ پر باضابطہ دستخط نہ ہونے کے باعث دلیپ کمار انھیں اب تک ٹالتا رہا۔ لیکن پچھلے چند سالوں میں بمل رائے کی ایک کے بعد ایک چار فلمیں (دیکھو اس نے کہا تھا، کابلی والا، پریم پتر) ناکام ہو گئیں تو ان کی مالی حالت کافی نازک ہو گئی۔ ان کی دو اعلان شدہ فلمیں بندھنی اور بھائی جان تقریباً رک ہی گئیں مگر آخر کار بمل رائے نے اپنی اگلی رنگین فلم کے لئے دلیپ کمار کو راضی کر لیا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ یہ فلم سراج الدولہ کی زندگی پر مبنی ہوگی۔ دیگر تفصیلات کا اعلان ابھی تک نہیں کیا گیا۔

شنکر جے کشن کی مقبولیت میں کمی

کئی فلمسازوں نے ساتھ چھوڑ دیا

ریڈیو اور پریس کے سہارے کے باوجود شنکر جے کشن کی پچھلے دنوں کچھ اتنی فلمیں ناکام ہو چکی ہیں کہ کئی اہم فلمسازوں نے انھیں اگلی فلموں میں نظر انداز کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ چنانچہ ناصر حسین نے او۔ پی نیر، ال۔ بی فلمز نے کلیان جی آنند جی پرساد نے روشن اور مسعود ھ سکرجی نے برمن کو لے لیا ہے۔

لتا منگیشکر اور رفیع میں شدید اختلافات

غالباً اب وہ ایک ساتھ نہیں گا سکیں گے

لتا منگیشکر اور محمد رفیع ہندوستانی فلموں کے مقبول ترین پس منظر گلوکار ہیں۔ ہماری فلموں میں موسیقی کی غیر معمولی اہمیت کے باعث لتا منگیشکر اور محمد رفیع کی آوازوں کا فلموں کی کامیابی میں زبردست حصہ رہا ہے۔ یہ خبر انتہائی افسوسناک ہے کہ اب دونوں میں شدید اختلافات پیدا ہو چکے ہیں اور شاید اب وہ دونوں ایک ساتھ گانا نہیں گائیں گے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس اختلاف کی بڑی وجہ پس منظر گلوکاروں کے ریکارڈس کی بکری کی رائلٹی ہے۔ پچھلے دنوں جب محمد رفیع نے یہ اعلان کیا کہ وہ رائلٹی کے بیجا مطالبے سے دست بردار ہو گئے ہیں تو گلوکاروں کی انجمن نے ایک میٹنگ بلائی۔ وہیں لتا اور رفیع میں تو تو میں میں ہو گئی جس کے بعد لتا نے احتجاجاً رفیع کے ساتھ کبھی نہیں گانے کا اعلان کیا۔

آج کل چونکہ ہیرو زیادہ مقبول ہیں اسی لئے رفیع کے گیت لتا سے زیادہ مقبول ہو رہے ہیں۔ اس اعلان کے نتیجے میں شنکر جے کشن اور چترگپت نے دو گیت رفیع اور سمن کلیان پور کے ریکارڈ کئے۔ یہ بھی توقع کی جاتی ہے کہ بعض موسیقار ان دونوں میں مفاہمت کرا دیں گے۔

نگاہ

غیر جانبدار فلمی تبصرے

محمود انصاری

سن آف انڈیا

کسی امریکی فلمساز نے کہا تھا کہ مستقبل میں امریکی فلموں کو بیرونی ممالک میں دو چیزوں کا مقابلہ کرنا پڑیگا اور وہ ہیں ٹیلی ویژن اور ہندوستانی فلمیں۔ غالباً انہوں نے سن آف انڈیا جیسی کوئی فلم دیکھ لی تھی کیونکہ سن آف انڈیا بھی کامیاب امریکی فلموں کی طرح اپنی فنی خوبیاں بہترین اداکاری اور جاندار ڈرامائی لمحات سے آپ کو متاثر کرنے کے ساتھ آپ کی دلچسپی بھی برقرار رکھتی ہے لیکن امریکی فلموں کی طرح اس کی کہانی حقیقت سے دور اور ہدایت کاری چھوٹی موٹی بیسیوں غلطیوں سے بھرپور ہے۔

اس فلم کی کہانی اور منظرنامہ انتہائی پیچیدہ بے ربط بلکہ عجیب و غریب ہے۔ بعض مرتبہ تو دس دس منٹ تک کہانی کا تسلسل نہیں ملتا۔ عوام کی تفریح کی خاطر ایسی کئی باتیں فلم میں موجود ہیں جن کا فلم کی تھیم سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ مرکزی کردار انتہائی غیر فطری ہے۔ کہانی نے جگہ جگہ ناممکن اتفاقات اور انہونے واقعات کا سہارا لیا ہے۔ فلم دیکھتے وقت کئی ایسے سوال ابھرتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں [illegible] اور غیر واضح کرداروں کے لیے یہ فلم مدتوں یاد رکھی جائے گی۔ کہانی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دیکھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رکھتی ہے۔

اس فلم میں محبوب ایک ہدایت کار سے زیادہ ایک فلمساز کی حیثیت سے کامیاب ہیں۔ جہاں انہوں نے فنی خوبیوں کے لئے بے پناہ اہتمام کیا ہے وہیں معمولی معمولی غلطیوں کو دور کرنے میں بری طرح ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی اور کرداروں کے متعلق ان کے پاس کوئی واضح تصور [illegible] ہی ہے

www.taemeernews.com

کر انھوں نے بالکل معمولی ستاروں کی کامیاب اداکاری پیش کی ہے۔ اور ڈرامائی لمحات کو بہت موثر بنا دیا ہے۔

تین مکالمہ نویسوں نے مل کر اس فلم کے مکالمے لکھے ہیں لیکن اس کے باوجود غیر معمولی نہیں کہے جا سکتے البتہ ساجد کے بعض مکالمے انتہائی بے ساختہ اور پیارے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ساجد کو انھوں نے ایک بڑے آدمی کی زبان دیدی ہے لیکن اس کی ذمہ داری ان کی بجائے کہانی نویس اور ہدایت کار پر عائد کی جا سکتی ہے۔

ساجد نے اپنا کردار بڑے ہی پیارے انداز میں بے خوف ہو کر ادا کیا ہے لیکن ساجد کے بچپن کا رول ادا کرنے والا لڑکا نیلو ساجد سے بھی کچھ آگے ہی نظر آتا ہے۔ خوبصورت عکاسی نے کم کم کو بھی کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ سمی اور بھگت آدراچھے اضافے ہیں۔ جینت کی اداکاری لاجواب ہے لیکن بے جان کرداروں نے کنھیا لعل اور کمار کو کہیں کا بھی نہیں رکھا۔

فنی اعتبار سے اس فلم کا یقیناً بہت بلند مقام ہے۔ فریدون ایرانی کی غیر معمولی عکاسی اس فلم کی جان ہے۔ سارے ہندوستان کے مناظر انھوں نے کچھ ایسے نئے زاویوں سے پیش کئے ہیں کہ وہ دل پر نقش ہو جاتے ہیں۔ کم کم اور کمل جیت جیسے معمولی چہروں کو خوبصورت بنا دینا ان ہی کا حصہ ہے۔

یوں تو سیٹس انتہائی شاندار ہیں۔ لیکن ان کے رنگ کچھ زیادہ ہی گہرے ہیں۔ منظرنامے نے ایڈیٹر کو کچھ اتنا مجبور بنا دیا ہے کہ وہ کچھ اہم کاٹ چھانٹ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود نشاطی تیز رفتار ہے۔

نوشاد پر دھنیں دہرانے کا الزام ہی غلط ہے کیونکہ وہ صرف ایک چیز دہراتے ہیں اور وہ ہے کامیابی۔ نوشاد کی متنوع اور مقبول موسیقی اس فلم کی نمایاں خوبی ہے شکیل نے دھن اور سچویشن کے ساتھ ساتھ کرداروں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ بہرحال سن آف انڈیا محبوب کے ستاروں کی پہلی کامیاب بڑی فلم ہے۔

دل تیرا دیوانہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محمود کو بڑے بڑے اداکاروں پر چھا جانے کا چسکا لگ چکا ہے۔ "پرورش" کے کئی مناظر اور "منزل" کے ایک منظر میں محمود نے راجکپور اور دیو آنند جیسے اداکاروں کو صفر کے برابر بنا دیا تھا لیکن "دل تیرا دیوانہ" میں وہ شمی کپور پر کچھ اس حد تک چھا گیا ہے کہ لوگ اسے ہیرو اور شمی کپور کو سائیڈ ہیرو کہنے لگے ہیں۔

یہ فلم محض عوام کی تفریح کے لئے بنائی گئی ہے اور اس مقصد میں کہانی نویس مکالمہ نویس اور محمود کے سہارے یہ بڑی حد تک کامیاب ہے۔ حالانکہ شمی کپور اور شنکر جے کشن جب بھی داخل ہوتے ہیں لوگ جمائیاں لینے لگتے ہیں۔

عکاسی اور آرٹ اوسط درجہ کا ہے مگر تدوین کمزور ہے۔ محمود اور کچھ حد تک دم پرکاش اور پران کے علاوہ تمام اداکار قطعی بے جان ہیں۔ شمی کپور اور مالا سنہا تو بس آتے ہیں گاتے ہیں اور جاتے ہیں ــــــــ آجکل فلموں کے ریلیز کے بعد فلم میں کاٹ چھانٹ اور رد و بدل کا رواج چل نکلا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس فلم میں بھی چار چھ گیت اور پانچ چھ ہزار فیٹ شمی کپور والی سیلولائیڈ کاٹ دی جائے تاکہ فلم زیادہ دلچسپ زیادہ تیز رفتار اور زیادہ کامیاب بن سکے ■

www.taemeernews.com

جائزے

کھیلوں پر تبصرے

محمود انصاری

سانپ کے گذر جانے کے بعد لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن ڈیوس کپ کے انٹرزون فائنل میں میکسیکو کے مقابلے میں ہند کی شکست کا تجزیہ کرنا ہمارے ٹینس کے روشن مستقبل کے لئے ضروری ہے۔

ایک عرصہ پہلے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ میکسیکو اور ہند کی ٹیمیں تقریباً مساوی طاقت رکھتی ہیں کیونکہ ان کے پاس بھی عالمی شہرت یافتہ کھلاڑی ایک ہی تھا اور ہمارے پاس بھی ایک ہی ہے۔ ڈبلز کی حد تک بھی ہم بڑی حد تک مطمئن تھے۔ ہماری کامیابی کی پیش گوئی کرنے والے اس بات کو بڑی اہمیت دیتے تھے کہ میچ کرشنن کے شہر میں گراس کورٹ پر ہو رہا ہے کیونکہ کرشنن نے مدراس میں ہر بڑے کھلاڑی کو شکست دی تھی اور گراس کورٹ ان کے لئے بہت زیادہ سہولت بخش تھا۔

ان تمام وجوہات کے باوجود ہماری ٹیم کو جو زبردست شکست ہوئی اس پر غور کرنا بھی ضروری ہے۔

سب سے اہم بات تو یہ تھی کہ ہمارے کھلاڑیوں کا حوصلہ انتہائی پست تھا۔ میکسیکو نے ابھی پچھلے دنوں امریکہ اور سویڈن جیسے ممالک سے مقابلے میں کھیل کر میچ پریکٹس حاصل کی جب کہ ہمارے کھلاڑی پہلے تو آرام کر رہے تھے اور پھر اس کے بعد ان کی کوچنگ مدراس کے گراس کورٹ کی بجائے دہلی کے ہارڈ کورٹ پر ہوئی۔ ہند کو شکست دے کر میکسیکو نے اپنی ٹیم کو انتہائی طاقتور ثابت کیا ہے۔

× × ×

سنا گیا ہے کہ شکست کے بعد کرشنن نے کہا "کاش: ملک میں ہنگامی حالات کے باعث ہم میکسیکو کے حق میں دست بردار ہو جاتے!"

(پرنٹر و پبلیشر اعظم راہی نے دائرہ پریس کے لئے پرنٹو پریس میں چھپوا کر ۱۹۲ - ریڈ ہلز حیدرآباد سے شائع کیا)

www.taemeernews.com

آج کے سائنسی دور میں ہر گھر میں ریڈیو کا رہنا ضروری ہے

پیراڈائز ریڈیوز

گوشہ محل سرراہا حیدرآباد تشریف لائیے

جہاں ہر قسم کے نئے اور پرانے ریڈیو کی

خرید و فروخت اور نہایت اعلیٰ قسم کی ریپیرنگ کی جاتی ہے

امراض رحم کے لئے یقینی فائدہ مند

ڈسمنورال

(ہر قسم کے نقصان دہ اثرات

ماہواری درد کے لئے

ماہواری کی زیادتی کیلئے

ماہواری کی اور بے وقت کے لئے

OPENING SHORTLY

3-ACES

DELUXE

RESTAURANT
& BAR

With Garden

IN

VICAJEES HOTEL

ABID RAOD, HYDERABAD.